ماہنامہ

اشراق

لاہور

جنوری ۲۰۲۵ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

1979
سے جاری شدہ
اشاعت کے
46 سال

”دین کی جو حقیقت قرآن میں بیان ہوئی ہے، دین کے احکام کی درجہ بندی بھی اُسی کے لحاظ سے ہوگی اور ہونی چاہیے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دینی اخلاقیات میں پروردگار کی معرفت اور اُس کے ساتھ سچے تعلق سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوسکتی اور وقت کی پابندی کے ساتھ نماز اِسی تعلق کا اظہار ہے، لہٰذا اعمال میں اللہ کو سب سے زیادہ پسند بھی یہی ہونی چاہیے۔“

—— معارف نبوی

- اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہے کہ اس نے اپنے گناہ گار بندوں کے لیے معافی کا راستہ کھول رکھا ہے۔ کوئی نیک سے نیک انسان بھی یہ دعویٰ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا کہ اس کا اعمال نامہ کسی گناہ، بلکہ گناہوں کے اندراج سے خالی ہے۔ چنانچہ ہر بندہ معافی کا محتاج ہے۔ (شذرات)
- عالم کا پروردگار انسان کو خود بلا رہا ہے کہ وہ اپنی حاجات اُس کے سامنے پیش کرے۔ اُس کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ اُس کی بارگاہ تک رسائی کے لیے کسی وسیلے یا سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کا ہر بندہ، جب چاہے اور جہاں سے چاہے، اُس کے ساتھ براہ راست رابطہ پیدا کر سکتا ہے اور جو کچھ مانگنا چاہے، اُس سے مانگ سکتا ہے۔ (قرآنیات)
- جن لوگوں نے گناہ کی زندگی گزاری ہے، توبہ کا راستہ ان کے لیے بھی موجود ہے، لیکن ان کو اپنے تائب ہونے کو حقیقت بنانا ہے۔ ان کو اپنے ماضی کو دھونے کی مشقت اٹھانی ہے۔ یہ اپنے گناہوں کا اپنے رب کے حضور سچا اعتراف کریں۔ جن کی تلافی ہو سکتی ہے، ان کی تلافی کریں۔ آیندہ گناہوں سے بچنے کا عہد کریں اور اس پر حتی المقدور کاربند رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے توقع یہی ہے کہ ان کی سچی واپسی کی قدر ہو گی۔ (شذرات)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم وتحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ وتلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول وفروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق وتنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشرواشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان واخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم وتعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما وصالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر وعبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب ونظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور
زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۷ شمارہ ۱ جنوری ۲۰۲۵ء رجب المرجب ۱۴۴۶ھ

فہرست

شذرات

بندۂ تائب	طالب محسن	۴
کراچی عالمی کتب میلہ میں "المورد" کی شرکت	سید محمد رضوان علی	۹

قرآنیات

البیان: المومن ۴۰: ۵۶-۸۵ (۳)	جاوید احمد غامدی	۱۲

معارف نبوی

اہم ترین عبادت	جاوید احمد غامدی / محسن ممتاز	۲۱

مقالات

میزان: توضیحی مطالعہ: اصول و مبادی (۳)	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر	۲۳

سیر و سوانح

السابقون الاولون من الانصار (۱)	محمد وسیم اختر مفتی	۳۵

نقطۂ نظر

زنا کی حرمت کی بنیاد	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۴۴
ہندومت اور تصور نبوت؟ (۳)	مشفق سلطان	۴۷

اصلاح و دعوت

اللہ کی معیت میں رہنا!!	معاذ بن نور	۵۶

یسئلون

اسلام: امن و سلامتی کا دین	شاہد رضا	۵۸

شخصیات

حیات امین احسن (۱۶)	محمد بلال	۶۶

تبصرۂ کتب

"قرآن و سنت کا باہمی تعلق"	معاویہ محب اللہ	۷۸

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد
طالب محسن
ڈاکٹر عبید الرحمٰن
ڈاکٹر شہزاد سلیم
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر
اظہار احمد
جنید حسن
محمد رفیع مفتی
محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر ساجد حمید
آصف افتخار
خورشید احمد ندیم
کوکب شہزاد
مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

طالب محسن

بندۂ تائب

اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہے کہ اس نے اپنے گناہ گار بندوں کے لیے معافی کا راستہ کھول رکھا ہے۔ کوئی نیک سے نیک انسان بھی یہ دعویٰ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا کہ اس کا اعمال نامہ کسی گناہ، بلکہ گناہوں کے اندراج سے خالی ہے۔ چنانچہ ہر بندہ معافی کا محتاج ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور اسے مالک ارض و سما اپنی ردائے عفو سے ڈھانپ لے۔

شیاطین جن و انس چاروں جانب سے برائیوں پر اکسانے کے لیے حملہ آور رہتے ہیں۔ خود انسان کے اندر بھوک، حرص، ہوس، تعصب، انا اور تفوق جیسے محرکات ہیں، جو اسے اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز پر ابھارتے ہیں۔ یہ دنیا، اس کی نعمتیں؛ خاندان، اس کے ناتے؛ گروہ اور جماعتیں، ان کا بندھن؛ افراد، ان سے رشتے؛ رنگ، نسل اور زبان کے امتیازات، غرض طرح طرح کے اسباب ہیں، جن کے باعث انسان راہ صواب سے منحرف ہوتا ہے اور کبیرہ یا صغیرہ گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

بندۂ رب (مسلمان) کی زندگی اصل میں صحت ایمان اور صحت عمل سے عبارت ہے، یعنی ایمان اور عمل صالح۔ ان دونوں کو قرآن مجید نے جگہ جگہ یکجا بیان کیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں جنت کے صلے کا استحقاق ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. (۲: ۸۲)

”اور جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، وہی جنت کے لوگ ہیں۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

وہ بندۂ رب جس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے رب کی جنت پانے کے لائق بننا چاہتا ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ایمان کی صحت کا اہتمام کرے، اس میں شرک کی آلودگی کو کسی صورت میں شامل نہ ہونے دے اور نہ اللہ تعالیٰ، اللہ کے رسولوں اور آخرت کے بارے میں کوئی ایسا تصور قائم کرے جو قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسرے سے لیا گیا ہو۔ اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دین کے تمام احکام کا پابند رہے۔ احکام کی یہ پابندی حکم کے عملی اور قلبی تقاضے پورے کرتے ہوئے کی جائے۔

یہ زندگی نبھانا، اصل امتحان ہے۔ اوپر ہم نے برائی میں پڑنے کے چند داعیات کا ذکر کیا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزارنے کے فیصلے کے باوجود برائی کے داعیات ہر بندۂ مومن کو گھیرے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید نے ان احوال کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۳۵)

”حقیقت یہ ہے کہ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور ہم اچھے اور برے حالات سے تم لوگوں کو آزما رہے ہیں، پرکھنے کے لیے اور تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

خیر و شر کی یہی آزمایشیں ہیں جن سے ہر بندہ گزرتا ہے۔ پھر وہ محرکات اور داعیات ہیں جو دامن گیر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بندہ کبھی جادۂ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے اور کبھی اعمال خیر میں ریا، غفلت، کوتاہی اور عدم آمادگی جیسے عیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ صورت معاملہ کی سنگینی ہے، اسی لیے اللہ رحمٰن و رحیم نے توبہ کا قانون جاری فرمایا۔ سورۂ نساء میں معاف کر دینے کا ایک قاعدہ وعدے کی حیثیت سے بیان ہوا ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. (۴: ۱۷)

”اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ سو وہی ہیں جن پر اللہ عنایت کرتا اور اُن کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔“

چوری جیسے کبیرہ گناہ کی سزا بیان کرنے کے بعد فرمایا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

”اور چور مرد ہو یا عورت اُن کے ہاتھ کاٹ دو، اُن کے عمل کی پاداش میں اور اللہ کی طرف سے

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.(المائدہ۵:۳۸-۳۹)

عبرت ناک سزا کے طور پر اور (یاد رکھو کہ) اللہ سب پر غالب ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ پھر جس نے اپنے اِس ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کرلی تو اللہ اُس پر عنایت کی نظر کرے گا۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔‘‘

سورۂ نساء کی آیت توبہ سے متعلق یہ ضابطہ واضح کرتی ہے کہ اگر گناہ کا ارتکاب کسی وقتی محرک کے باعث ہوا اور گناہ گار نے جلد ہی معافی مانگ لی ہو تو اس معافی کو قبول کرنا اللہ کے ذمے ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت میں یہ نوید مذکور ہے کہ بڑے سے بڑے گناہ کے بعد بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ شرط یہ ہے کہ معافی مانگنے والا اپنی اصلاح کا پختہ ارادہ کیے ہوئے ہو۔

اگر توبہ کرنے والے نے رجوع کا حق ادا کر دیا تو اللہ اس کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے۔ یہ نوید سورۂ فرقان میں دی گئی ہے:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا.(۲۵:۷۰-۷۱)

’’مگر یہ کہ جس نے توبہ کرلی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کیے تو اِسی طرح کے لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اور جو توبہ کرے اور اچھے عمل کرے، اُس کو مطمئن ہونا چاہیے، اِس لیے کہ وہ پوری سرخ روئی کے ساتھ اللہ ہی کی طرف لوٹتا ہے۔‘‘

دنیا میں تین طرح کے تائب پائے جاتے ہیں:

ایک توبہ کرنے والے وہ ہیں جن پر گناہ کے بھنور سے نکلتے ہی پچھتاوا طاری ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی تلافی کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اصل میں خیر وصلاح اور طاعات کی زندگی گزارنے والے ہیں۔ ان کا گناہ کسی سوچے سمجھے ارادے سے وجود میں نہیں آتا، بلکہ کسی وقتی طور پر طاری ہونے والی حالت سے گناہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے گناہ کے بعد توبہ کرنے میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ یہ اصل میں صالحین ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو یہ خوش خبری دے دی گئی ہے کہ ان کی توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمے ہے۔ سورۂ توبہ میں

معلوم ہوتا ہے، انھی کا ذکر ہوا ہے:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ.(۹:۱۱۲)

”وہ توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، شکر کرنے والے ہیں، (خدا کی راہ میں) سیاحت کرنے والے ہیں، (اُس کے آگے) رکوع اور سجدہ کرنے والے ہیں، بھلائی کی تلقین کرنے والے ہیں، برائی سے روکنے والے ہیں اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ وہی سچے مومن ہیں، (اے پیغمبر)، اور اِن مومنوں کو خوش خبری دے دو۔“

دوسرے توبہ کرنے والے وہ ہیں جو ہیں تو مسلمان، لیکن ان کی زندگی تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی نہیں ہے۔ یہ گناہ کرتے ہیں اور بالعموم ضمیر کی آواز نہیں سنتے، لیکن کسی موقع پر توبہ واصلاح کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، جس کا ایک حوالہ اوپر سورۂ مائدہ میں چوری کے جرم کی نسبت سے بیان ہوا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی ایک قسم کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.

(التوبہ ۹:۱۰۲)

”کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ اُنھوں نے ملے جلے عمل کیے تھے، کچھ بھلے اور کچھ برے۔ امید ہے کہ اللہ اُن پر عنایت فرمائے، اِس لیے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔“

یعنی گناہ گار تو ہیں، لیکن ان کے اندر سچا اعتراف اور رجوع پیدا ہوا ہے۔ ان کو معاف کر دیے جانے کی امید دلائی گئی ہے۔ پہلے لوگوں کی طرح یہ نہیں فرمایا کہ ان کی توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمے ہے۔

تیسرے لوگ وہ ہیں جو موت کو سامنے دیکھ کر توبہ کرتے ہیں۔ ان کی توبہ قبول ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

جن لوگوں نے گناہ کی زندگی گزاری ہے، توبہ کا راستہ ان کے لیے بھی موجود ہے، لیکن ان کو اپنے تائب ہونے کو حقیقت بنانا ہے۔ ان کو اپنے ماضی کو دھونے کی مشقت اٹھانی ہے۔ یہ اپنے گناہوں کا اپنے رب کے

حضور سچا اعتراف کریں۔ جن کی تلافی ہو سکتی ہے، ان کی تلافی کریں۔ آیندہ گناہوں سے بچنے کا عہد کریں اور اس پر حتی المقدور کاربند رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے توقع یہی ہے کہ ان کی سچی واپسی کی قدر ہو گی۔

اصل مطلوب کردار پہلے لوگوں کا ہے۔ صالحیت اور تقویٰ جن کی اصل زندگی ہے۔ گناہوں سے بچ کر رہنے کی سعی ان کے ہاں پیہم ہے۔ یہی اس توبہ کی توفیق پاتے ہیں، جو یقیناً قبول کر لی جائے گی۔

یتیم کے مال میں خیانت

’’... یتیم کے مال میں کوئی ناجائز تصرف نہ کیا جائے۔ اِس حکم کے الفاظ وہی ہیں جو ... زنا سے روکنے کے لیے آئے ہیں۔ یعنی یتیم کی بہبود اور بہتری کے ارادے کے سوا اُس کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ یتیم کے مال میں صرف وہی تصرف جائز ہے جو اُس کی حفاظت اور نشو و نما کی غرض سے کیا جائے اور اُسی وقت تک کیا جائے، جب تک یتیم سن رشد کو پہنچ کر اپنے مال کی ذمہ داری خود سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ ... چنانچہ فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا، اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا. (النساء ۴: ۱۰)

’’یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔‘‘‘‘

(جاوید احمد غامدی، میزان ۲۳۳)

سید محمد رضوان علی

کراچی عالمی کتب میلہ میں ”المورد“ کی شرکت

انیسواں کراچی عالمی کتب میلہ ۱۲ سے ۱۶/ دسمبر ۲۰۲۴ء تک ایکسپو سینٹر کراچی میں منعقد ہوا۔ المورد پچھلے چار سالوں سے اس کتب میلہ میں شریک ہو رہا ہے۔ اور میں ہر سال المورد کی ٹیم کے ساتھ، جو کہ عظیم صاحب اور حافظ عزیز صاحب پر مشتمل ہوتی ہے، رضاکارانہ طور پر شامل ہو رہا ہوں۔ اس مضمون میں اسی سفر کی کچھ روداد سنانا پیش نظر ہے۔ اس کتب میلہ کا ہر آنے والا سال المورد اور فکر فراہی کے لیے خوشی کی نوید لے کر آیا ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب ہم پہلے سال اس میں شریک ہوئے تھے تو حالات کچھ زیادہ ساز گار نہیں تھے۔ محبت کرنے والے تو اس وقت بھی آتے رہتے تھے، لیکن مدارس کے طلبا کی طرف سے ایک عمومی فضا بغیر سمجھے تنقید کی نظر آتی تھی، ایک ایسی تنقید جو کسی کے افکار و نظریات کو براہ راست سنے اور پڑھے بغیر کی جاتی ہے۔

اس کے برعکس، اللہ کے فضل سے آج حالات اس قدر ساز گار ہیں کہ علما اور طلبا کی طرف سے غامدی صاحب کی کتابوں اور فکر فراہی کو سمجھنے کا ایک خاص رجحان نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں دیگر اہل علم کی تصنیفات کے ساتھ ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر صاحب کی کتابوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے قرآن و سنت کے باہمی تعلق کو ہماری علمی تاریخ میں ٹریس کر کے اس میں فکر فراہی اور غامدی صاحب کی خدمات کو جس طرح واضح کیا ہے، اس کی وجہ سے دینی روایت سے وابستہ افراد کے لیے فکر فراہی کی تفہیم آسان ہو گئی ہے۔ اس سال کتب میلہ کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جس میں معاشرے کے ہر طبقہ کی جانب سے بہترین رسپانس دیکھنے کو نہ ملا ہو، چاہے وہ اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل نوجوان ہوں یا مدارس سے پڑھے ہوئے طلبا، ہر کوئی انتہائی محبت اور خلوص

سے پیش آیا اور مہنگائی کے اس دور میں کتابوں پر خصوصی ڈسکاؤنٹ کی گزارش بھی کی جاتی رہی۔

علما اور دانش وروں سے ملاقات کے ساتھ ساتھ طلبا سے بھی بات کرنے کے مواقع گاہے گاہے میسر آئے۔ ان گفتگوؤں کے بعد میں یہ بات بہ آسانی کہہ سکتا ہوں کہ غامدی صاحب کی فکر اب اجنبی نہیں رہی۔ ایک زمانہ تھا جب پروپیگنڈا کے ذریعے سے حقائق کو مسخ کرنا ممکن تھا، لیکن اب سوشل میڈیا اور سمارٹ فون کے ذریعے سے ایسا کرنا ممکن نہیں رہا، کیونکہ اب کوئی شخص کیا نظریہ رکھتا ہے، اس کے لیے آپ بہت آسانی کے ساتھ اس کے افکار و نظریات کو خود اس کی زبان سے سن سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ۲۳ اعتراضات سیریز نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سیریز کے ذریعے سے غامدی صاحب نے اپنے اوپر وارد ہونے والے اعتراضات کا علمی اور تحقیقی جواب دیا ہے، اور اب یہ کتابی شکل میں بھی شائع ہونا شروع ہو گئی ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کتاب کے خریدنے والوں میں شامل تھی، اور جو لوگ یہ سیریز سن کر آتے، وہ اپنے علم کی روایت اور اس کی محبت سے سرشار نظر آتے۔

کراچی میں یہ کتب میلہ المورد کے لیے صرف کتب کی تجارت کا پلیٹ فارم نہیں رہا، بلکہ حقیقی معنوں میں پانی کا ایک ایسا چشمہ بن چکا ہے، جہاں علم کی پیاس بجھانے والے وارد ہوتے رہتے ہیں۔ وہ غامدی صاحب سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں، ان کی تصویر کو دیکھ کر خوش ہوتے اور اسی کو غنیمت جان کر اس کے ساتھ تصاویر بناتے ہیں۔ کتنے افراد یہ پوچھتے نظر آئے کہ کراچی میں المورد کی کوئی شاخ ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو کب تک بنے گی؟ چاہے کوئی عالم ہو یا طالب علم، غامدی صاحب کا عشاق ہو یا نقاد ہر کوئی محبت اور احترام سے پیش آتا اور استاذ گرامی کے علمی کام کو سراہتا ہوا نظر آیا۔ خصوصی طور پر جید اہل حدیث عالم قاری خلیل الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوئی، جو بہت محبت سے پیش آئے اور پوچھنے پر مسکراتے ہوئے فرمانے لگے کہ ''غامدی صاحب کو ہم ضرور پڑھتے ہیں، مگر ہماری اور ان کی رگیں آپس میں نہیں ملتیں''۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی صاحب تشریف لائے اور نئی آنے والی کتب کے بارے میں دریافت فرمایا اور ان کی خریداری کی۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی شفقت اور محبت سے ملے اور حسن الیاس بھائی کا ذکر خیر بھی ہوا۔ ممتاز عالم مولانا محمود الحسینی صاحب اپنے ساتھ کافی علماے کرام کو لے کر وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے اور فکر فراہی کے بارے میں آگاہی فراہم کرتے رہے۔ غامدی صاحب کے ناقد مفتی فضل صاحب بھی تشریف لائے اور محبت سے ملے۔

ایک عالم دین محمد نبی صاحب سے ملاقات ہوئی، جو پشین سے تشریف لائے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''جس دن ہمارے تمام علمانے آؤٹ آف کورس مطالعہ شروع کر دیا، اس دن ان کی نظر میں نہ مولانا مودودی گم راہ

قرار پائیں گے اور نہ غامدی صاحب پر فتوے لگ سکیں گے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ نصاب کے علاوہ دیگر کتب کے مطالعہ کی ترغیب ہی نہیں دی جاتی''۔ دار العلوم کراچی کے فارغ التحصیل اویس بھائی کے مطابق ''مدرسوں میں سوال کرنے کو عمومی طور پر پسند نہیں کیا جاتا''۔ یہی وجہ ہے کہ تجسس کی جبلت کے حامل طالب علم پھر اسی چشمۂ صافی کا رخ کرتے اور اللہ کے فضل سے جواب حاصل کرتے ہیں اور دین متین کی صداقت پر اپنی عقلوں کو 'آمنا و صدقنا' کہتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ میں چونکہ بذات خود بک فیئر میں موجود ہوتا تھا، اس لیے جانتا ہوں کہ وہ کیا طلب ہے جو علما اور طلبا کو غامدی صاحب کی فکر کے پاس کھینچ کر لا رہی تھی۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب ان شاءاللہ سب جان جائیں گے کہ اس عہد کے چیلنج کا جواب اللہ کے فضل سے فکر فراہی نے دیا ہے۔

آخر میں جناب شکیل الرحمٰن صاحب اور جناب ریحان احمد یوسفی صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ انتہائی تندہی اور اخلاص کے ساتھ تمام معاملات کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ خصوصی طور پر جناب عظیم صاحب اور جناب حافظ عزیز صاحب کا تذکرہ کرنا بھی انتہائی ضروری ہے، کیونکہ یہ دونوں حضرات مکمل لگن اور محنت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور ان کے اخلاق اور محبت نے لوگوں سے انسیت پیدا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ماہنامہ ''انذار'' کے رکن جناب شفیق صاحب بھی ہر موقع پر ساتھ رہے اور مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں کی۔

مضمون کا اختتام غامدی صاحب کے ان الفاظ پر کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے مدرستہ الاصلاح میں ویڈیو لنک سے خطاب کرتے ہوئے امام فراہی کے علمی کام اور دور حاضر میں اس کے متوقع اثرات کو بیان کرتے ہوئے ادا کیے تھے:

> ''آپ ان کی تفاسیر کا مطالعہ کریں، آپ ان کے مسودات کا مطالعہ کریں، ہر جگہ وہ مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تشکیل جدید کی بنیادیں فراہم کر رہے ہیں۔ میں طلبہ کی خدمت میں بھی اور اساتذہ کی خدمت میں بھی یہ عرض کروں گا کہ وہ اس زاویے سے امام فراہی کا مطالعہ کریں۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ اگر ایک جانب مغربی مفکرین کی تہذیبی دریافتوں پر ختم ہو رہی ہے —— جیسا کہ مغربی تہذیب کے مفکرین کا خیال ہے —— تو دوسری جانب اللہ کی یہ آیات بھی نمودار ہو چکی ہیں۔ 'آیت من آیات اللّٰہ'۔ اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت، اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی۔ اور کیا بعید ہے کہ اس آخری زمانے میں اللہ کی حجت اللہ کی کتاب کے ذریعے سے فکر فراہی کی روشنی میں پوری ہو جائے۔''[1]

1-https://youtu.be/Rwv6iG9xmgc?feature=shared

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المؤمن

(۳)

اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ ۙ اِنْ فِیْ صُدُوْرِهِمْ
اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِیْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۵۶﴾
لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بغیر کسی سند کے، جو اُن کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکال رہے ہیں، اُن کے دلوں میں تو صرف بڑائی کی ہوس سمائی ہے[۱۴۶] جس کو وہ کبھی پانے والے نہیں ہیں۔ سو (اِن سے بے پروا ہو جاؤ اور) اللہ کی پناہ مانگتے رہو۔ وہی درحقیقت سننے والا، دیکھنے والا ہے۔[۱۴۷] ۵۶

(اِنھیں تعجب ہے کہ لوگ مرنے کے بعد کس طرح اٹھائے جائیں گے)! واقعہ یہ ہے کہ زمین

۱۴۶۔ یعنی مخالفت کی وجہ محض بڑائی کی ہوس ہے، اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حق اِن پر واضح نہیں ہوا یا اُس کے خلاف یہ کوئی دلیل اپنے پاس رکھتے ہیں۔

۱۴۷۔ لٰہذا مطمئن رہو، اِن متکبروں کے شر سے وہی تم کو محفوظ بھی رکھے گا۔

النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ
فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ
لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

اور آسمانوں کو پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔(اِن کا خیال ہے کہ سب مر کر مٹی ہو جائیں گے۔ ہرگز نہیں)، اندھے اور بینا[148] برابر نہیں ہو سکتے اور نہ ایمان والے اور نیکوکار اور جو برائی کرنے والے ہیں، وہ برابر ہو سکتے ہیں۔(لوگو)، تم بہت کم سوچتے ہو۔[149] یہ بالکل قطعی ہے کہ قیامت آکے رہے گی، اِس میں کوئی شک نہیں، مگر اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں۔(اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ بندگی سے گریزاں ہیں) اور تمھارا پروردگار کہہ چکا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمھاری التجائیں قبول کروں گا۔[150] یہ حقیقت ہے کہ

۱۴۸۔ اِس سے عقل و دل کے اندھے اور بصیرت رکھنے والے مراد ہیں۔

۱۴۹۔ یعنی ذرا سا بھی عقل و فہم سے کام نہیں لیتے، ورنہ یہ حقائق ایسے نہیں تھے کہ سمجھ میں نہ آتے۔

۱۵۰۔ یہ بندگی کی دعوت کا انتہائی دل نواز اسلوب ہے۔ عالم کا پروردگار انسان کو خود بلا رہا ہے کہ وہ اپنی حاجات اُس کے سامنے پیش کرے۔ اُس کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ اُس کی بارگاہ تک رسائی کے لیے کسی وسیلے یا سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کا ہر بندہ، جب چاہے اور جہاں سے چاہے، اُس کے ساتھ براہ راست رابطہ پیدا کر سکتا ہے اور جو کچھ مانگنا چاہے، اُس سے مانگ سکتا ہے۔ اُس نے اگر صحیح چیز، صحیح طریقے سے اور صحیح وقت پر مانگی تو اُس کا پروردگار ضرور اُسے عطا فرمائے گا اور اگر کسی حکمت کے تحت موخر کرے گا تو کسی دوسرے وقت میں عطا فرما دے گا۔ بندے کو چاہیے کہ وہ خدا کے فیصلوں پر راضی رہے، اُس سے مایوس ہو کر ابلیس کی طرح سرکشی اختیار نہ کرے اور نہ اُس کا دروازہ چھوڑ کر دوسروں کے دروازے پر جائے، بلکہ زندگی کے آخری سانس تک اُسی کی دہلیز سے چمٹا رہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَالنَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ
فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ
رَبُّکُمۡ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۶۲﴾ کَذٰلِکَ یُؤۡفَکُ
الَّذِیۡنَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۶۳﴾

جو لوگ غرور کے مارے میری بندگی سے سرتابی کرتے ہیں،[151] وہ ذلیل ہو کر عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے۔۵۷-۶۰

(لوگو)، اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمھارے لیے تاریک بنایا تاکہ اُس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ اُس میں کام کرو۔[152] حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔[153] یہی اللہ تمھارا پروردگار ہے،[154] ہر چیز کا خالق، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔[155] پھر کہاں سے اوندھے ہو جاتے ہو؟ اِسی طرح وہ لوگ بھی اوندھے ہوتے رہے ہیں جو (تم سے پہلے) اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔۶۱-۶۳

۱۵۱۔ اصل الفاظ ہیں: 'یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ'۔ اِن میں 'عَنۡ' اِس بات کا قرینہ ہے کہ 'اِسۡتِکۡبَار' یہاں اعراض کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۱۵۲۔ اِس آیت میں 'الَّیۡلَ' کے بعد 'مُظۡلِمًا' اور 'مُبۡصِرًا' کے بعد 'لِتَعۡمَلُوۡا' کے الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر محذوف ہیں۔ اِس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

۱۵۳۔ لہٰذا بندگی سے سرتابی کرتے اور اُس کے شریک ٹھیرانے لگتے ہیں۔

۱۵۴۔ یعنی جس نے رات اور دن کا یہ الٹ پھیر پیدا کیا، پھر اِس کے باوجود کہ دونوں اضداد تھے، اُن کے اندر ایسی سازگاری اور ہم آہنگی رکھ دی کہ دونوں مل کر انسان کی پرورش کرتے ہیں اور اس طرح زبان حال سے بتاتے ہیں کہ ہمارا خالق، اللہ ہی تمھارا پروردگار ہے۔

۱۵۵۔ یہ اُس کے خالق ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اِس لیے کہ جب نہ خلق میں اُس کا کوئی شریک ہے، نہ مخلوقات کے نظم و تدبیر میں تو اُس کے سوا کسی کو معبود کیوں بنایا جائے؟

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ
صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۵﴾

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ
مِنْ رَّبِّيْ ۫ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ
ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ

اللہ ہی ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے مستقر اور آسمان کو چھت بنایا اور تمھاری صورت گری کی تو تمھاری صورتیں نہایت عمدہ بنائیں اور تم کو پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا فرمایا۔ یہی اللہ تمھارا پروردگار ہے۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، جہانوں کا پروردگار۔ وہی زندہ ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اُسی کو پکارو، اطاعت کو اُس کے لیے خالص کر کے۔ شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے، جہانوں کا پروردگار۔ ۶۴-۶۵

اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ مجھے تو اِس سے روک دیا گیا ہے کہ میں اُن کی بندگی کروں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ (نہیں، میں اُن کی بندگی نہیں کر سکتا)، جب کہ میرے پروردگار کی طرف سے میرے پاس کھلی دلیلیں آچکی ہیں اور مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں اپنے آپ کو رب العٰلمین کے حوالے کر دوں۔[۱۵۶] وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر تم کو وہ بچے کی صورت میں ماں کے پیٹ سے نکالتا ہے، پھر تم کو پروان

۱۵۶۔ یعنی پرستش بھی اُسی کی کروں اور اطاعت بھی اُسی کی اور پورے دل کے ساتھ اُس کے سامنے سرافگندہ رہوں۔

لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى
وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ هُوَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٦٨﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِىْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿٦٩﴾ ۛ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٠﴾ ۙ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِىْٓ

چڑھاتا ہے کہ اپنی جوانی کو پہنچو، پھر تم کو مہلت دیتا ہے کہ بڑھاپے کو پہنچ جاؤ۔[۱۵۷] اور تم میں سے کوئی اِس سے پہلے ہی مر جاتا ہے اور کسی کو وہ مہلت دیتا ہے[۱۵۸] کہ تم ایک مقرر مدت پوری کر لو اور یہ سب اِس لیے کہ تم (حقائق کو) سمجھو۔[۱۵۹] وہی ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت بھی۔ (اُس کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے)۔ چنانچہ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کو صرف یہ کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۶۶-۶۸

تم نے دیکھے نہیں یہ لوگ جو (اِن سب حقائق کو دیکھتے اور اِس کے باوجود) اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں، یہ کہاں سے پھیر دیے جاتے ہیں؟ (یہی) جنھوں نے اللہ کی اِس کتاب کو[۱۶۰] جھٹلا دیا اور اُن صحیفوں کو بھی جن کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا۔ سو عنقریب جان لیں

۱۵۷۔ اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ، ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا'۔ اِن میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں اور دونوں سے پہلے عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق ایک ایک جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔

۱۵۸۔ اوپر جس اسلوب کا ذکر ہے، اُسی کے مطابق یہ الفاظ بھی آیت میں محذوف ہیں۔

۱۵۹۔ یعنی وہ حقائق جو خدا کی قدرت و حکمت اور توحید و آخرت سے متعلق انبیا علیہم السلام نے واضح فرمائے ہیں۔

۱۶۰۔ یعنی قرآن مجید کو، جو وہی تعلیم دیتا ہے جو اللہ کے پیغمبر اور اُس کی تمام کتابیں دیتی رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن کو جھٹلا دیا تو گویا سب کو جھٹلا دیا۔ آگے اِسی کی وضاحت ہے۔

اَعۡنَاقِهِمۡ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسۡحَبُوۡنَ ﴿۷۱﴾ فِى الۡحَمِيۡمِ ۙ ثُمَّ فِى النَّارِ يُسۡجَرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ ۚ
ثُمَّ قِيۡلَ لَهُمۡ اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تُشۡرِكُوۡنَ ﴿۷۳﴾ ۙ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوۡا ضَلُّوۡا عَنَّا بَلۡ
لَّمۡ نَكُنۡ نَّدۡعُوۡا مِنۡ قَبۡلُ شَيۡـئًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۷۴﴾ ذٰلِكُمۡ
بِمَا كُنۡتُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَمۡرَحُوۡنَ ﴿۷۵﴾ ۚ اُدۡخُلُوۡۤا
اَبۡوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۚ فَبِئۡسَ مَثۡوَى الۡمُتَكَبِّرِيۡنَ ﴿۷۶﴾

گے، جب اِن کی گردنوں میں طوق اور اِن کے پاؤں میں[161] زنجیریں ہوں گی۔ یہ کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹے جائیں گے، پھر آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔ پھر اِن سے پوچھا جائے گا: کہاں ہیں وہ جنھیں تم اللہ کے مقابل میں شریک ٹھیراتے تھے؟ یہ کہیں گے: وہ ہم سے کھوئے گئے، نہیں، بلکہ ہم تو اِس سے پہلے کسی چیز کو پوجتے ہی نہیں رہے۔ اللہ اِس طرح اِن منکروں کے حواس گم کر دے گا (کہ مانیں گے بھی اور انکار بھی کریں گے)۔[162] ارشاد ہو گا: یہ تم اِس انجام کو اِس لیے پہنچے کہ زمین میں ناحق ریجھتے پھرتے رہے[163] اور اِس لیے کہ تم اتراتے تھے۔ (اب جاؤ)، جہنم

۱۶۱۔ یہ الفاظ اصل میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق محذوف ہیں۔

۱۶۲۔ اِس کیفیت کی طرف قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں بھی اشارے ہیں کہ ایک ہی سانس میں یہ متکبرین اپنے معبودوں کا اقرار بھی کریں گے اور انکار بھی کہ شاید یہی چیز اِن کے لیے کچھ نافع ہو جائے۔

۱۶۳۔ اِسے ناحق اِس لیے کہا ہے کہ انسان کو دنیا میں جو چیزیں بھی ملتی ہیں، اُن میں سے کوئی بھی اُسے اُس کے کسی ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں ملتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اور اُسی کی ملکیت ہے۔ اِس وجہ سے صرف اُسی کے لیے تکبر زیبا ہے، کسی دوسرے کے لیے یہ زیبا نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا تکبر کرتا ہے تو یہ ’بِغَیۡرِ الۡحَقِّ‘ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خاص ردا اپنے اوپر ڈالنے کی جسارت کر رہا ہے، جو شرک ہے۔ ’الکبریاء ردائی‘ میں اِسی حقیقت کی یاد دہانی کی گئی ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۷/ ۶۴)

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ
فَاِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ ﴿٧٧﴾

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِكَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ
نَقۡصُصۡ عَلَيۡكَ ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ
اَمۡرُ اللّٰهِ قُضِىَ بِالۡحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿٧٨﴾

کے دروازوں میں[۱۶۴] داخل ہو جاؤ، تم اُس میں ہمیشہ رہو گے۔ سو کیا ہی برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا! ۶۹-۷۶

(یہ نہیں مان رہے، اے پیغمبر)، تو صبر کرو۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ پھر جس عذاب کی وعید ہم اِنھیں سنا رہے ہیں، اُس کا کچھ حصہ ہم تمھیں دکھا دیں یا تم کو وفات دیں اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں،[۱۶۵] بہر کیف اِن کو پلٹنا ہماری ہی طرف ہے۔ ۷۷

تم سے پہلے بھی ہم نے بہت سے رسول بھیجے ہیں۔ اُن میں وہ بھی ہیں جن کے حالات ہم نے تمھیں سنا دیے ہیں اور وہ بھی جن کے حالات ہم نے تمھیں نہیں سنائے۔ اُن میں سے کسی رسول کا مقدور نہ تھا کہ اللہ کے اذن کے بغیر وہ کوئی نشانی لے آئے۔[۱۶۶] اِس لیے (انتظار کرو)، جب اللہ کا حکم آجائے گا تو پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اُس وقت یہی اہل باطل خسارے میں ہوں گے۔ ۷۸

۱۶۴۔ یہ اُن سات دروازوں کی طرف اشارہ ہے جن کی تفصیل دوسرے مقام میں ہو چکی ہے۔

۱۶۵۔ یہ اُس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر ہے۔ اِس میں بالعموم یہی دو صورتیں پیش آتی ہیں۔ پہلی صورت کی مثالیں قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں۔ دوسری صورت کی مثال یہود ہیں جن کی پیٹھ پر عذاب کا تازیانہ مسیح علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد برسنا شروع ہوا۔

۱۶۶۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمھارے مخاطبین اگر بار بار عذاب کی نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کا فیصلہ کسی رسول کے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ اِسے ہمیشہ خدا نے کیا ہے اور اب بھی وہی اپنی حکمت کے تحت، جب مناسب سمجھے گا، کرے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَنۡعَامَ لِتَرۡكَبُوۡا مِنۡهَا وَمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ﴿۷۹﴾
وَلَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ وَلِتَبۡلُغُوۡا عَلَيۡهَا حَاجَةً فِىۡ صُدُوۡرِكُمۡ وَعَلَيۡهَا وَعَلَى
الۡفُلۡكِ تُحۡمَلُوۡنَ ؕ﴿۸۰﴾ وَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَىَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنۡكِرُوۡنَ ﴿۸۱﴾
اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ
كَانُوۡۤا اَكۡثَرَ مِنۡهُمۡ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِى الۡاَرۡضِ فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا
يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۸۲﴾

(لوگو، نشانیاں مانگتے ہو تو ذرا یہ نشانی بھی دیکھو کہ) اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے چوپایے پیدا کیے کہ اُن میں سے کسی سے سواری کا کام لو اور کسی کو تم کھاتے ہو اور اُن میں تمھارے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں۔ یہ اِس لیے بھی پیدا کیے گئے کہ تمھارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو، تم اُن پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاؤ۔[۱۶۷] (تم اگر غور کرو تو صحراؤں اور سمندروں میں) تم اُن پر اور کشتیوں پر لدے پھرتے ہو۔ وہ اپنی اور بھی نشانیاں تمھیں دکھاتا ہے، پھر تم اللہ کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے! ۷۹-۸۱

(یہ نہیں مانتے) تو کیا یہ اِس ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اِن سے پہلے گزرے ہیں؟ وہ اپنی قوت کے لحاظ سے بھی اِن سے کہیں بڑھ کر اور زمین میں اپنے آثار کے لحاظ سے بھی اِن سے کہیں زیادہ تھے[۱۶۸] تو اُن کی یہ کمائی اُن کے کچھ کام بھی نہیں آئی۔ ۸۲

۱۶۷۔ یہ اشارہ اونٹ کی طرف ہے جو اہل عرب کے لیے گویا سفینۂ صحرا تھا۔

۱۶۸۔ اصل الفاظ ہیں: 'كَانُوۡۤا اَكۡثَرَ مِنۡهُمۡ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِى الۡاَرۡضِ'۔ اِن میں 'اَكۡثَرَ' کا تعلق 'اٰثَارًا فِى الۡاَرۡضِ' سے اور 'اَشَدَّ' کا 'قُوَّةً' سے ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ وَحَاقَ بِهِمۡ
مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿٨٣﴾ فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ وَكَفَرۡنَا
بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشۡرِكِيۡنَ ﴿٨٤﴾ فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ سُنَّتَ
اللّٰهِ الَّتِىۡ قَدۡ خَلَتۡ فِىۡ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿٨٥﴾

چنانچہ اُن کے رسول جب اُن کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے تو وہ اپنے اُس علم پر نازاں رہے[169] جو اُن کے پاس تھا اور اُنھیں اُس عذاب نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ پھر جب اُنھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو پکار اٹھے کہ ہم خداے واحد پر ایمان لائے اور ہم اُن سب چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم خدا کے شریک ٹھیراتے تھے۔ پر جس وقت ہمارا عذاب دیکھ چکے تو اُن کا یہ ایمان اُن کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہوا۔ یہی اللہ کی سنت ہے جو اُس کے بندوں میں جاری رہی ہے۔ اور جو منکر تھے، وہ اُس وقت خسارے میں رہے۔ ۸۳-۸۵

۱۶۹۔ یعنی وہ علم جو اُنھوں نے دنیوی ذرائع سے حاصل کیا تھا اور جسے وہ اپنی تمدنی ترقیوں کی بنیاد سمجھتے تھے۔

کوالالمپور

۲۶/ جولائی ۲۰۱۴ء

معارف نبوی

فقہ النبی

جاوید احمد غامدی
ترجمہ و تحقیق: محسن ممتاز

اہم ترین عبادت

—— ۱ ——

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ، قَالَ:[۱] سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّ العَمَلِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ؟ قَالَ: «الصَّلَاةُ[۲] عَلَى وَقْتِهَا».

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اعمال میں کیا چیز اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟[۱] آپ نے فرمایا: وقت کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا۔[۲]

۱۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام نے دین کی حقیقت کو کس عمق کے ساتھ سمجھا تھا اور وہ اگر کبھی استفسار بھی کرتے تھے تو کن چیزوں کے بارے میں کرتے تھے۔

۲۔ اِس جواب سے واضح ہے کہ دین کی جو حقیقت قرآن میں بیان ہوئی ہے، دین کے احکام کی درجہ بندی بھی اُسی کے لحاظ سے ہو گی اور ہونی چاہیے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دینی اخلاقیات میں پروردگار کی معرفت اور اُس کے ساتھ سچے تعلق سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور وقت کی پابندی کے ساتھ نماز اِسی تعلق کا اظہار ہے، لہٰذا اعمال میں اللہ کو سب سے زیادہ پسند بھی یہی ہونی چاہیے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۵۹۷۰ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے متابعات اِن مراجع میں نقل ہوئے ہیں: جامع معمر بن راشد، رقم ۲۰۲۹۵۔ مسند طیالسی، رقم ۳۷۰۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۵۰۱۴۔ سنن سعید بن منصور، رقم ۲۳۰۲۔ مسند ابن جعد، رقم ۴۷۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۰۲، ۳۲۱۰۔ مسند احمد، رقم ۳۸۹۰، ۳۹۷۳، ۳۹۹۸، ۴۱۴۶، ۴۲۱۳، ۴۲۴۳، ۴۲۸۵۔ سنن دارمی، رقم ۱۲۶۱۔ الادب المفرد، بخاری، رقم ۱۹۔ صحیح بخاری، رقم ۲۷۸۲۔ صحیح مسلم، رقم ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰۔ سنن ترمذی، رقم ۱۷۳، ۱۸۹۸۔ مسند بزار، رقم ۱۷۹۱۔ تعظیم قدر الصلاۃ، مروزی، رقم ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۵۹۳۔ سنن نسائی، رقم ۶۱۱۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۵۲۸۶، ۵۳۲۹۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۱۸۳، ۱۰۰۳۔ شرح مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۲۱۲۵، ۲۱۲۷۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۴۷۴، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۹۸۰۲، ۹۸۰۵۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۳۱۶۵۔

الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ یہ روایت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ اِس کے شواہد اِن مراجع میں دیکھے جا سکتے ہیں:

مصنف عبد الرزاق، رقم ۳۷۸۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۷۸۱۔ مسند ابن جعد، رقم ۱۱۷۸۔ مسند احمد، رقم ۲۱۳۲۴، ۲۱۳۸۹، ۲۱۴۲۳، ۲۱۴۴۵، ۲۱۴۷۸، ۲۱۴۷۹۔ سنن دارمی، رقم ۱۲۶۳، ۱۲۶۴۔ الادب المفرد، بخاری، رقم ۹۵۴، ۹۵۷۔ صحیح مسلم، رقم ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۲۔ سنن نسائی، رقم ۷۷۸، ۸۵۹۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۱۲۵۶۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۱۶۳۷، ۱۶۳۹۔ مسند سراج، رقم ۱۱۸۰۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۱۰۰۶۔ شرح معانی الآثار، طحاوی، رقم ۲۱۴۴۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۴۸۲، ۱۷۱۹۔

۲۔ بعض طرق، مثلاً جامع معمر بن راشد، رقم ۲۰۲۹۵ میں ’الصَّلَاۃُ‘ کے بجاے ’الصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ لِوَقْتِهِنَّ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

میزان — توضیحی مطالعہ

اصول و مبادی

(۳)

مبادی تدبر قرآن (۲)

قرآن کی سورتوں کی ترتیب

''قرآن میں سورتیں، جس طرح کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، کسی الل ٹپ طریقے سے جمع نہیں کی گئیں، بلکہ ایک خاص نظام ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ترتیب دیا ہے اور سورتوں میں نظم کلام کی طرح یہ ترتیب بھی اُس کے موضوع کی رعایت سے نہایت موزوں اور بڑی حکیمانہ ہے۔'' (میزان ۵۴)

مصنف نے اس اقتباس میں قرآن مجید میں سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے اور موضوعاتی اعتبار سے ایک خاص نظام میں مربوط ہونے کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ سورتوں کی ترتیب میں موجود معنوی نظام کے سوال پر آگے چل کر ''نظم کلام'' کی بحث کے تحت ضروری توضیحات پیش کی جائیں گی۔ یہاں سورتوں کی ترتیب کے توقیفی یا اجتہادی ہونے کے حوالے سے اہل علم کے مابین پائے جانے والے اختلاف اور اس ضمن میں مصنف کے نقطۂ نظر کی توضیح کی جا رہی ہے۔

اس ضمن میں اہل علم کی ایک بڑی جماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن کی سورتیں مصحف میں جس ترتیب سے رکھی گئی ہیں، یہ بنیادی طور پر صحابہ کا اجتہاد ہے (سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن ۱/۲۱۶)۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ تاریخی روایات کے مطابق اکابر صحابہ کے مصاحف میں سورتوں کی ترتیب مختلف تھی۔ نیز بعض آثار سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کے نزدیک سورتوں میں کسی خاص ترتیب کو ملحوظ رکھنا اہم نہیں تھا۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق مروی ہے کہ کوفہ سے آئے ہوئے ایک شخص نے انھیں بتایا کہ اس کے علاقے میں قرآن کسی ترتیب کے بغیر پڑھا جا رہا ہے اور پھر ان سے فرمایش کی کہ وہ اسے اپنا مصحف دکھائیں تاکہ وہ اس کے مطابق اپنے مصحف میں بھی سورتوں کو مرتب کر لے۔ اس پر سیدہ نے اس سے کہا کہ:

وما يضرك أيه قرأت قبل؟ إنما نزل أول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار، حتى إذا ثاب الناس إلى الإسلام نزل الحلال والحرام ... وما نزلت سورة البقرة والنساء إلا وأنا عنده. (بخاری، رقم ۴۷۲۷)

”تم کوئی بھی سورت پہلے پڑھ لو، اس سے تمھیں کیا فرق پڑے گا؟ ابتدا میں قرآن کی سورتوں میں سے مفصل کی ایک سورت نازل ہوئی تھی، جس میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے۔ پھر جب لوگ اسلام قبول کرنے لگے تو حلال اور حرام کے احکام نازل ہوئے۔ ... اور جب (مدینہ میں آنے کے بعد) سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء نازل ہوئیں تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی تھی۔“

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن کی باقی تمام سورتوں کی ترتیب تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی تھی، لیکن سورۂ انفال اور سورۂ براءۃ کو صحابہ نے اپنے اجتہاد سے موجودہ مقام پر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ امام بیہقی لکھتے ہیں:

واعلم أن القرآنَ كان مجموعًا كلّه في صدور الرجال، أيام حياة رسول الله صلى الله عليه وسلم، ومؤلفًا هذا التأليف الذي نشاهده ونقرؤه إلا سورة براءة، فإنها كانت من آخر ما نزل من القرآن، ولم يبيّن رسول الله صلى الله عليه وسلم لأصحابه موضعها

”جان لو کہ پورا قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں صحابہ کے سینوں میں جمع تھا اور اسی ترتیب کے مطابق مرتب تھا جو ہمارے سامنے ہے اور جس کے مطابق ہم اسے پڑھتے ہیں، سوائے سورۂ براءۃ کے، کیونکہ یہ قرآن میں سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورہ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سورتوں کی ترتیب میں اس کی

من التأليف، حتى خرج من الدنيا، فقرنها الصحابة بالأنفال.
(السنن الکبریٰ ۲/ ۵۰۱)

جگہ نہیں بتائی تھی، یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے اور صحابہ نے اسے سورۂ انفال کے ساتھ ملا دیا۔''

اس نقطۂ نظر کی بنیاد عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت پر ہے، جس میں وہ بتاتے ہیں کہ:

قلت لعثمان بن عفان: ما حملكم أن عمدتم إلى الأنفال وهي من المثاني وإلى براءة وهي من المئين فقرنتم بينهما ولم تكتبوا بينهما سطر بسم الله الرحمٰن الرحيم ووضعتموها في السبع الطول، ما حملكم على ذلك؟ فقال عثمان: كانت الأنفال من أوائل ما نزلت بالمدينة وكانت براءة من آخر القران وكانت قصتها شبيهة بقصتها فظننت أنها منها، فقبض رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يبين لنا أنها منها، فمن أجل ذلك قرنت بينهما ولم أكتب بينهما سطر بسم الله الرحمٰن الرحيم، فوضعتها في السبع الطول.
(ترمذی، رقم ۳۱۵۸)

''میں نے سیدنا عثمان سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ لوگوں نے سورۂ انفال کو، جو مثانی، (یعنی ۱۰۰ سے کم آیات والی سورتوں) میں سے ہے، اور سورۂ براءۃ کو، جو 'مئین' (یعنی ۱۰۰ سے زائد آیات والی سورتوں) میں سے ہے، اکٹھا کر دیا اور دونوں کے مابین بسم اللہ بھی نہیں لکھی اور دونوں کو قرآن کی سات لمبی سورتوں کے درمیان رکھ دیا؟ سیدنا عثمان نے کہا کہ انفال مدینہ میں بالکل ابتدا میں نازل ہوئی تھی، جب کہ سورۂ توبہ بالکل آخر میں قرآن میں نازل ہوئی، اور اس کا مضمون سورۂ انفال کے مضمون کے مشابہ تھا، جس کی وجہ سے مجھے خیال ہوتا تھا کہ یہ سورۂ انفال ہی کا حصہ ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور ہمیں یہ نہیں بتایا کہ یہ انفال کا حصہ ہے۔ اس وجہ سے میں نے دونوں سورتوں کو ملا دیا اور دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی اور ان کو سات لمبی سورتوں کے درمیان رکھ دیا۔''

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن کی تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حین حیات پورے قرآن کو سورتوں کی موجودہ ترتیب کے ساتھ مرتب فرما دیا تھا۔ ان اہل علم کے نزدیک قرآن مجید جس ترتیب سے لوح محفوظ میں موجود ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول مکمل ہونے کے بعد اس کا اسی ترتیب سے

مرتب ہونا ضروری تھا۔ جبریل ہر سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت تک نازل شدہ سورتوں کا دور کرتے تھے جو لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق ہوتا تھا۔ اسی طریقے کے مطابق عرضۂ اخیرہ میں بھی قرآن کی تمام سورتیں اپنی موجودہ ترتیب کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سنادی گئی تھیں (سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن ۱/۲۱۷۔ فراہی، تفسیر سورۂ قیامہ، ص ۲۳۳)۔

یہ اہل علم اس ضمن میں ان روایات سے بھی استشہاد کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی سورتوں کی موجودہ ترتیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی معروف تھی۔ مثلاً واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أعطيت مكان التوراة السبع، وأعطيت مكان الزبور المئين، وأعطيت مكان الإنجيل المثاني، وفضلت بالمفصل. (احمد، رقم ۱۶۶۷۵)

”مجھے تورات کی جگہ قرآن کی سات لمبی سورتیں دی گئی ہیں، زبور کی جگہ ’مئین‘ (۱۰۰ آیات والی سورتیں) اور انجیل کی جگہ مثانی دی گئی ہیں، اور مفصل کی سورتیں مجھے اس پر زائد عنایت کی گئی ہیں۔“

ایک روایت میں اوس بن حذیفہ بیان کرتے ہیں کہ وہ عہد نبوی میں بنو ثقیف کے وفد کے ساتھ مدینہ آئے تھے (جو رمضان ۱۰ ہجری کا واقعہ ہے)۔ اس موقع پر انھوں نے قرآن کے حصوں کے متعلق صحابہ سے دریافت کیا تو انھیں یہ جواب دیا گیا:

فسألنا أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم حين أصبحنا، قال: قلنا: كيف تحزبون القرآن؟ قالوا: نحزبه ثلاث سور، وخمس سور، وسبع سور، وتسع سور، وإحدى عشرة سورة، وثلاث عشرة سورة، وحزب المفصل من قاف حتى يختم. (احمد، رقم ۱۵۸۶۵)

”صبح ہوئی تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے پوچھا کہ آپ قرآن کی سورتوں کو مختلف حصوں میں کیسے تقسیم کرتے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ ہم انھیں اس طرح تقسیم کرتے ہیں: (فاتحہ کے بعد) تین سورتیں، پھر پانچ سورتیں، پھر سات سورتیں، پھر نو سورتیں، پھر گیارہ سورتیں، پھر تیرہ سورتیں اور آخر میں سورۂ قاف سے قرآن کے آخر تک باقی سورتیں۔“

روایت میں مذکورہ سورتوں کے سات مجموعوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا مجموعہ بقرہ سے نساء تک تین سورتوں پر،

دوسرا مجموعہ مائدہ سے توبہ تک پانچ سورتوں پر،

تیسرا مجموعہ یونس سے النحل تک سات سورتوں پر،

چوتھا مجموعہ بنی اسرائیل سے فرقان تک نو سورتوں پر،

پانچواں مجموعہ شعراء سے یٰس تک گیارہ سورتوں پر،

چھٹا مجموعہ الصافات سے الحجرات تک تیرہ سورتوں پر

اور ساتواں مجموعہ ق سے الناس تک قرآن کی باقی سورتوں پر مشتمل ہے۔

اس تقسیم میں سورۂ براءۃ بھی شامل ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی سورتوں کی یہ ترتیب قائم ہو چکی تھی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من أخذ السبع الأول من القرآن فهو حبر. (احمد، رقم ۲۴۰۰۹)

"جو قرآن کی پہلی سات سورتیں سیکھ لے، وہ تو ایک بڑا عالم ہے۔"

ان روایات کا حوالہ دیتے ہوئے ابو جعفر النحاس لکھتے ہیں:

فيه البيان أن تأليف القرآن عن الله تعالیٰ، وعن رسوله، لا مدخل لأحد فيه ... فهذا التأليف من لفظ رسول الله صلى الله عليه وسلم، وهذا أصل من أصول المسلمين لا يسعهم جهله، لأن تأليف القرآن من إعجازه. (الناسخ والمنسوخ ۱/ ۴۷۸)

"اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی ترتیب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے ہے اور اس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں۔... یہ ترتیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق رکھی گئی ہے اور یہ مسلمانوں کے بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے، جس سے وہ لاعلم نہیں ہو سکتے، کیونکہ قرآن کی ترتیب بھی اس کے اعجاز کا حصہ ہے۔"

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت کی استنادی حیثیت

جہاں تک سورۂ براءۃ سے متعلق سیدنا عثمان کے بیان کا تعلق ہے تو کئی اہل علم نے، جن میں سورتوں کی ترتیب کو اجتہادی قرار دینے والے بعض حضرات بھی شامل ہیں، اس پر مختلف اشکالات اور تحفظات پیش کیے ہیں۔ مثلاً

ابو جعفر النحاس اور امام طحاوی کی راے میں سورۂ براءۃ کو سورۂ انفال کا حصہ تصور کرنا سیدنا عثمان کا ذاتی گمان تھا، جو حقیقت واقعہ سے ناواقفیت پر مبنی تھا، کیونکہ ان دونوں کا الگ الگ سورتیں ہونا متعدد دلائل سے ثابت ہے (شرح مشکل الآثار ۳/ ۴۰۴۔ الناسخ والمنسوخ ۱/ ۴۷۷۔ ۴۸۳)۔

قاضی ابو بکر الباقلانی نے اس روایت کے ان الفاظ کو غیر محفوظ قرار دیا ہے جن سے مترشح ہوتا ہے کہ سیدنا عثمان، سورۂ براءۃ کو سورۂ انفال ہی کا حصہ گمان کرتے تھے، کیونکہ روایت سے ہی یہ واضح ہے کہ انھیں ان دونوں سورتوں کا الگ الگ ہونا معلوم تھا۔ لکھتے ہیں:

ولسنا نعلمُ قطعًا أن كلام عثمان خرج على هذا الوجه، بل لعله خرج على وجه آخرَ بزيادةِ لفظة ونقصان لفظة اختصرَه الراوي أو زادَ فيه، ويدل على ذلك أيضًا أنّ عثمانَ قد قال وعَلِمَ أن كلّ واحدة من السورتين لها اسمٌ يخُصها وعَلَمٌ تُعرَفُ به. (الانتصار للقرآن ۱/ ۲۸۲)

’’ہم قطعی طور پر نہیں جانتے کہ سیدنا عثمان نے یہ بات بعینہٖ اسی طرح کہی تھی۔ ممکن ہے، انھوں نے کسی اور انداز میں کہی ہو جس کے الفاظ میں راوی نے کوئی کمی بیشی کر دی ہو (جس سے اس کا مفہوم بدل گیا ہو)۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ سیدنا عثمان (اسی روایت کے مطابق) جانتے تھے کہ یہ دونوں سورتیں دو الگ الگ ناموں سے معروف ہیں۔‘‘

ابن عباس کی اس روایت پر حدیث کے بعض محققین نے بھی سند اور متن کے حوالے سے تنقید کی ہے اور اسے ایک شاذ روایت قرار دیا ہے۔ مثلاً ماضی قریب کے معروف محدث احمد محمد شاکر لکھتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں یزید الفارسی ایک مجہول راوی ہے اور یہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب کے بارے میں بھی شک پیدا کرتی ہے جو کہ تواتر سے معلوم ہے۔ احمد شاکر لکھتے ہیں کہ محدثین کے مسلمہ اصول کی روشنی میں اس چیز کو اس روایت کے موضوع ہونے کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے:

وفيه تشكيك في معرفة سور القرآن الثابتة بالتواتر القطعي، قراءة وسماعًا وكتابة في المصاحف، وفيه تشكيك في إثبات البسملة في أوائل السور،

’’اس سے قرآن کی سورتوں کے متعلق بھی شک وشبہ پیدا ہوتا ہے، جو قراءۃً اور سماعاً اور لکھے ہوئے مصاحف میں قطعی تواتر سے ثابت ہے، اور سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ لکھنے کے متعلق بھی

كأن عثمان كان يثبتها برأيه وينفيها برأيه، وحاشاه من ذلك، فلا علينا إذا قلنا إنه «حديث لا أصل له» تطبيقًا للقواعد الصحيحة التي لا خلاف فيها بين أئمة الحديث.

(مسند احمد، تحقیق: احمد محمد شاکر ۱/۳۳۳)

شک جنم لیتا ہے۔ گویا عثمان رضی اللہ عنہ اپنی راے سے بسم اللہ لکھنے یا نہ لکھنے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم مستند قواعد کا اطلاق کرتے ہوئے جن کے متعلق ائمۂ حدیث کے مابین کوئی اختلاف نہیں، اس روایت کے متعلق اگر یہ کہیں کہ یہ بے بنیاد روایت ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔“

احمد شاکر نے یہی راے اپنے استاذ علامہ رشید رضا کے حوالے سے بھی نقل کی ہے۔ حدیث کے معاصر محقق، شعیب الارنؤوط نے بھی اس روایت سے متعلق احمد شاکر کی مذکورہ تحقیق کو نقل کر کے اس کی تائید کی ہے (مسند احمد، تحقیق: شعیب الارنؤوط ۱/۴۶۱)۔

ماضی قریب کے معروف محدث علامہ البانی نے بھی اس روایت کو سنداً ضعیف اور متن کے لحاظ سے منکر قرار دیا ہے۔ البانی لکھتے ہیں کہ روایت کے متن میں اس پہلو سے نکارت پائی جاتی ہے کہ سیدنا عثمان کی بات میں داخلی تضاد ہے۔ ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں کہ سورۂ انفال مدینہ کے ابتدائی دور میں اور براءۃ آخری دور میں نازل ہوئی تھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں کو الگ الگ سورتیں مان رہے ہیں، لیکن دوسری طرف وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ دونوں کا مضمون ملتا جلتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات سے پہلے یہ واضح نہیں کر سکے کہ سورۂ براءۃ، سورۂ انفال کا حصہ نہیں ہے، اس لیے میں نے دونوں کو اکٹھا رکھ دیا۔ البانی لکھتے ہیں:

ثم إن في الحديث نكارة، وهو قوله: قُبِض رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولم يبين لنا أنها منها فإنه ينافي قوله بعْدُ: وكانت الأنفال من أول ما أنزل عليه بالمدينة، وكانت (براءة) من آخر ما نزل من القرآن. (ضعیف ابی داؤد ۱/۳۰۸)

”پھر روایت میں نکارت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ سیدنا عثمان کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور ہمیں یہ نہیں بتایا کہ سورۂ براءۃ، سورۂ انفال کا حصہ ہے۔ پھر اس کے بعد اس سے متضاد بات کہتے ہیں کہ انفال مدینہ کے بالکل ابتدائی دور میں، جب کہ براءۃ بالکل آخری دور میں قرآن میں نازل ہوئی تھی (جس کا مطلب یہ ہے کہ براءۃ، انفال سے الگ ایک مستقل سورت ہے)۔“

مولانا امین احسن اصلاحی کا نقطۂ نظر

مولانا امین احسن اصلاحی نے مذکورہ مواقف میں سے تیسرے موقف سے اتفاق کیا اور سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے کا نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، البتہ مولانا نے اس کی تائید میں قرآن مجید سے ایک منفرد استدلال پیش کیا ہے۔ مولانا کے مطابق قرآن کی سورتوں کا ایک خاص ترتیب سے رکھا جانا خود قرآن میں منصوص ہے۔ اس کے لیے مولانا سورۂ حجر اور سورۂ زمر میں 'مَثَانِيَ' کی تعبیر سے استدلال کرتے ہیں، جو قرآن مجید کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

سورۂ زمر میں ارشاد ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ. (۳۹:۲۳)

"(لوگو)، اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب کی صورت میں جس کا ہر جزو دوسرے سے ہم رنگ اور جس کی سورتیں جوڑے جوڑے ہیں۔"

مفسرین نے عموماً 'مَثَانِي' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ قرآن میں ایک ہی مضمون کو مختلف اسالیب میں بار بار دہرایا گیا ہے یا یہ کہ قرآن کی آیات کی بار بار تلاوت کی جاتی ہے۔ مولانا اصلاحی نے اس تفسیر سے اس بنیاد پر اختلاف کیا ہے کہ 'مثاني'، 'مثنی' کی جمع ہے، جس کا مطلب بار بار دہرائی جانے والی چیز نہیں، بلکہ دو کا مجموعہ، یعنی جوڑا ہوتا ہے۔ قرآن میں اس لفظ کے تمام نظائر اسی مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ مثلاً:

فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَـكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ. (النساء۴:۳)

"تو ان خواتین سے جو تمھیں پسند ہوں، نکاح کرلو، دو دو، تین تین، چار چار۔"

اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوۡا. (سبا۳۴:۴۶)

"یہ کہ تم اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ، دو دو ہو کر اور اکیلے اکیلے، پھر غور کرو۔"

جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِىۡۤ اَجۡنِحَةٍ مَّثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ. (فاطر۳۵:۱)

"فرشتوں کو پیغام بر بنانے والا، جن کے دو دو، تین تین، چار چار پر ہیں۔"

مولانا اس سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ قرآن کو اس مفہوم میں 'مثاني' کہا گیا ہے کہ اس کی سورتیں معنوی مناسبت کے اعتبار سے جوڑا جوڑا ہیں، یعنی دو سورتیں مل کر ایک ہی مضمون کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتی

ہیں۔

اسی نکتے کی روشنی میں مولانا نے سورۂ حجر کی اس آیت کی بھی تفسیر کی ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ.(۱۵:۸۷) "اور ہم نے تمھیں سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کیا ہے۔"

مولانا کے نزدیک اس آیت میں 'سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ' اور 'الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ' کا مصداق ایک ہی ہے اور عطف، تفسیر و توضیح کے لیے ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم نے آپ کو قرآن عظیم دیا ہے، جس کی سورتیں جوڑا جوڑا ہیں اور قرآن میں ان سورتوں کو سات مجموعوں کی صورت میں رکھا گیا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق سورتوں کا سات مجموعوں میں تقسیم ہونا اور آپس میں جوڑے کی نسبت رکھنا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ان کی ترتیب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی گئی ہو۔

مولانا کی یہ تاویل بنیادی طور پر ان علماے تفسیر کی رائے سے ہم آہنگ ہے جو 'سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ' کا مصداق پورے قرآن کو قرار دیتے اور 'سَبْعًا' سے مراد قرآن مجید کی سورتوں کے سات مجموعے لیتے ہیں، تاہم 'مَثَانِیْ' کے مفہوم اور سات مجموعوں کی تعیین میں مولانا کی رائے ان سے مختلف ہے۔ چنانچہ ابن الجوزی نے ابن قتیبہ کے تفسیری قول کی روشنی میں 'سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ' کا مفہوم یوں واضح کیا ہے:

وقال ابن قتيبة: قد يكون المثاني سور القرآن كله، قصارها وطوالها، "ابن قتیبہ نے کہا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ مثانی سے مراد قرآن کی تمام چھوٹی اور بڑی سورتیں

۱۔ مفسرین مذکورہ آیت میں 'سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ' کے مصداق کی تعیین میں دو مزید آرا کا بھی ذکر کرتے ہیں:

ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے جس کی آیات کی تعداد بسم اللہ کو شامل کر کے سات بنتی ہے اور ان آیات کو اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ نماز میں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اس رائے کی تائید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے استشہاد کیا جاتا ہے جس میں آپ نے سورۂ فاتحہ کو 'السبع المثانی والقرآن العظیم' کا مصداق قرار دیا (بخاری، رقم ۴۴۷۴)۔

دوسری رائے ابن عباس اور بعض تابعین سے یہ منقول ہے کہ اس کا مصداق 'السبع الطوال'، یعنی قرآن کی سات لمبی سورتیں ہیں (نسائی، رقم ۹۱۲) جن میں البقرہ سے الاعراف تک اور اس کے بعد یونس کو شمار کیا جاتا ہے۔ یہ حضرات ان سورتوں کو اس مفہوم میں مثانی قرار دیتے ہیں کہ ان میں قرآن مجید کے بنیادی مضامین مثلاً اوامر و نواہی، قصص اور امثال وغیرہ بار بار دہرائے گئے ہیں۔

وإنما سمي مثاني لأنّ الأنباء والقصص تثنّى فيه، فعلى هذا القول المراد بالسبع: سبعة أسباع القرآن، ويكون في الكلام إضمار، تقديره: وهي القرآن العظيم. (زادالمسیر ۲/۵۴۲)

ہوں۔ ان کو مثانی اس لیے کہا گیا ہے کہ ان میں اخبار اور واقعات بار بار بیان کیے گئے ہیں۔ اس قول کی رو سے 'سَبْعًا' سے مراد قرآن کی سورتوں کے سات مجموعے ہوں گے اور جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ 'سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ'، ہی 'الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ' ہیں۔"

ان سات مجموعوں کی تعیین عموماً اس روایت کی روشنی میں کی جاتی ہے جو اوپر نقل کی جا چکی ہے اور جس میں ذکر ہوا ہے کہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق سات دنوں میں قرآن کی تلاوت مکمل کرنے کے لیے) صحابہ نے قرآن کی سورتوں کو سات مجموعوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔

اس رائے کے قائلین کے سامنے دو اہم اشکال ہیں، جن کا وہ جواب دیتے ہیں:

پہلا یہ کہ اگر اس کا مصداق پورا قرآن ہے تو پھر اس حدیث کا کیا مفہوم ہے جس میں سورۂ فاتحہ کو 'السبع المثانی' قرار دیا گیا ہے؟ اس کے جواب میں زرکشی لکھتے ہیں کہ قرآن کی اپنی تصریح کے مطابق پورا قرآن 'مثانی' ہے، اس لیے حدیث میں سورۂ فاتحہ کو 'السبع المثانی' کا مصداق قرار دینا اس اسلوب کے تحت ہے کہ قرآن میں سورۂ فاتحہ پر یہ مضمون سب سے زیادہ صادق آتا ہے:

وقد يكون اللفظ مقتضيًا لأمر ويحمل على غيره لأنه أولى بذلك الاسم منه وله أمثلة منها تفسيرهم السبع المثاني بالفاتحة مع أن الله أخبر أن القرآن كله مثاني. (البرہان ۲/۱۹۶)

"کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لفظ کا تقاضا تو کچھ اور ہوتا ہے، لیکن اسے محمول کسی اور مفہوم پر کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ اس کا زیادہ بہتر مصداق بن سکتا ہے۔ اس کی مثالوں میں سے ایک یہ ہے کہ 'السبع المثانی' کی تفسیر سورۂ فاتحہ سے کی جاتی ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے کہ پورا قرآن مثانی ہے۔"

دوسرا اشکال یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ حجر میں ہے، جو مکی سورہ ہے اور اس وقت تک نہ تو پورا قرآن نازل ہوا تھا اور نہ اس کی سات طویل سورتیں آپ کو دی گئی تھیں، جن میں سے بیش تر مدنی سورتیں ہیں، اس لیے اس آیت کے نزول کے وقت اس تعبیر کا مصداق پورے قرآن کو یا سات بڑی سورتوں کو کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

قرطبی نے اس اشکال کا ذکر کر کے اس کا جواب یوں دیا ہے:

وأنكر قوم هذا وقالوا: أنزلت هذه الآية بمكة ولم ينزل من الطول شيء إذ ذاك، وأجيب بأن الله تعالىٰ أنزل القرآن إلى السماء الدنيا ثم أنزله منها نجومًا، فما أنزله إلى السماء الدنيا فكأنما آتاه محمدًا صلى الله عليه وسلم وإن لم ينزل عليه بعد. (تفسیر القرطبی ۱۰/۵۵)

''اور ایک جماعت نے اس تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ آیت تو مکے میں تب اتری تھی جب ابھی سات لمبی سورتوں میں سے کوئی بھی نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن کو آسمان دنیا پر نازل کر دیا تھا اور پھر وہاں سے اس کو اجزا میں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر) اتارا گیا۔ تو جو چیز (آپ کو دینے کے لیے) اللہ نے آسمان دنیا پر اتار دی تھی، وہ گویا آپ کو عطا کر دی تھی، چاہے ابھی آپ پر نازل نہ کی گئی ہو۔''

آلوسی نے اس اشکال کا جواب عربی زبان کے ایک دوسرے اسلوب کے حوالے سے یوں دیا ہے:

وقيل: إنه تنزيل للمتوقع منزلة الواقع في الامتنان ومثله كثير.

(روح المعانی ۷/۳۲۱)

''اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایک ایسی چیز کو جو آیندہ متوقع ہے، گویا واقع شدہ فرض کر کے اس کا ذکر کرنے کا اسلوب ہے، جو احسان جتانے کے موقع پر اختیار کیا جاتا ہے اور اس کی مثالیں (قرآن میں) بہت ہیں۔''

مراد یہ کہ اللہ کی طرف سے پورا قرآن اتارنے کا جو وعدہ یقینی طور پر پایۂ تکمیل کو پہنچنے والا ہے، مقام امتنان میں اس کا ذکر اللہ نے یہاں یوں کر دیا ہے، جیسے وہ وعدہ پورا کیا جا چکا ہے۔

مولانا اصلاحی نے بنیادی طور پر اسی تیسری راے کو ترجیح دی ہے، البتہ مثانی کے مفہوم اور سورتوں کے سات مجموعوں کی تعیین میں مولانا کی راے تفسیری ذخیرے میں منفرد ہے۔ مولانا اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''رہا یہ سوال کہ اس کے 'مثانی' ہونے کا کیا مفہوم ہے تو اس کا صحیح جواب ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف ہم اس کتاب کے مقدمہ میں اشارہ کر آئے ہیں کہ قرآن کی تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔ ہر سورہ اپنے ساتھ اپنا ایک مثنیٰ بھی رکھتی ہے۔ ہم نے بڑی سورتوں میں سے بقرہ اور آل عمران کو اور چھوٹی سورتوں میں

معوذتین کو اس کی مثال میں پیش کیا ہے اور اپنی اس کتاب میں سورتوں کی تفسیر کرتے ہوئے ہم اس حقیقت کو برابر واضح کرتے آرہے ہیں۔

ہم نے مقدمہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرآن میں سورتوں کی ترتیب اس طرح ہے کہ ان کے الگ الگ سات گروپ یا سات مجموعے بن گئے ہیں۔ ہر گروپ ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن گویا سات ابواب پر مشتمل ہے جن کے اندر سورتوں کی حیثیت فصلوں کی ہے۔... اس روشنی میں زیر بحث آیت کی تاویل ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے تمھیں سات مثانی کا مجموعہ، یعنی قرآن عظیم دیا۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۳۷۷)

مولانا کی تحقیق کے مطابق ان میں سے پہلا مجموعہ فاتحہ سے المائدہ تک، دوسرا مجموعہ الانعام سے التوبہ تک، تیسرا مجموعہ یونس سے النور تک، چوتھا مجموعہ الفرقان سے الاحزاب تک، پانچواں مجموعہ سبا سے الحجرات تک اور ساتواں مجموعہ ق سے الناس تک کی سورتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر مجموعہ قرآن کے ایک باب کی، جب کہ سورتیں اس کی فصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔[۲]

مصنف نے بھی اس بحث میں مولانا اصلاحی کے موقف کو ہی اختیار کیا ہے۔

[باقی]

۲۔ اس رائے کی توضیح پر آگے ''نظم قرآن'' کے مبحث کے تحت بات کی جائے گی۔

محمد وسیم اختر مفتی

السابقون الاولون من الانصار

(۱)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

اصحاب بیعت عقبۂ اولیٰ وثانیہ

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ. (الحجر ۱۵: ۹۴)

''پس اے نبی، جو آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دیجیے اور مشرکوں کی ذرا پروا نہ کریں۔''

نبوت کے چوتھے سال جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ تبلیغ کا یہ حکم ہوا، آپ نے شہر مکہ کے علاوہ موسم حج میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں مکہ آنے والے عرب قبائل کو دعوت دین دینا شروع کی۔ آپ فرماتے: اے قبیلے والو، اللہ نے مجھے رسول بنا کر تم سب کی طرف بھیجا ہے، وہ حکم دیتا ہے کہ اللہ کی بندگی کرو، کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھیراؤ، اس کے ماسوا جن دیوتاؤں اور ان کے بتوں کی پوجا کرتے ہو، ان سے قطع تعلق کر دو، مجھ پر ایمان لاؤ، میری تصدیق کرو، اور میرا ساتھ دو تاکہ میں اس پیغام کو پہنچا سکوں جس کے لیے اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے۔ اس کے بدلے میں تمھیں جنت ملے گی۔ آپ یہ بھی فرماتے: میں تم میں کسی کو مجبور

نہیں کرتا، جو راضی ہوا اسے یہ دعوت دیتا ہوں۔ آپ کو ایک فرد بھی ایسا نہ ملا جو آپ کی دعوت قبول کر کے آپ کی نصرت کرتا۔ حضرت ربیعہ بن عباد فرماتے ہیں: میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذوالمجاز کے میلے میں دیکھا، آپ گلیوں میں داخل ہوتے جاتے اور لوگ آپ کے گرد جمع ہوتے جاتے۔ آپ فرماتے: لوگو، 'لا إلٰه إلا الله' کہہ لو، فلاح پاؤ گے، لوگو، 'لا إلٰه إلا الله' کہو، فلاح پاؤ گے، یہ کہہ کر تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمھارے زیر نگیں ہو جائے گا۔ تم ایمان لاؤ گے تو جنت میں بادشاہ بن جاؤ گے۔ آپ کے پیچھے کھڑا ہوا ایک خوب رو، مگر بھینگا، دو چوٹیوں والا، عدنی پوشاک پہنے شخص آگے بڑھتا اور کہتا: یہ شخص بے دین اور جھوٹا ہے، تمھیں لات و عزیٰ کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکنے کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ آپ کا چچا ابولہب تھا (احمد، رقم ۱۶۰۲۳۔ ۱۶۰۲۵۔ مستدرک حاکم، رقم ۳۹۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۷۲۷۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۴۵۸۹)۔ دوسری روایت کے مطابق ابولہب لعنہ اللہ نے آپ کے ٹخنوں پر پتھر بھی برسائے، جس سے ٹخنے لہولہان ہو گئے (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۱۰۹۶۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۵۶۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۷۷۲۰۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۱۵۹)۔ لوگ آپ کی بات بری طرح رد کرتے اور یہ کہہ کر کوفت پہنچاتے: آپ کا کنبہ اور قبیلہ آپ کو بہتر جانتا تھا، اسی لیے تو انھوں نے آپ کی پیروی نہیں کی۔ جو شخص اپنی قوم کو خراب کہے، ہمارے لیے کیسے موزوں ہو سکتا ہے۔ آپ ان سے مزید بات کرتے تو وہ جھگڑتے۔ آپ اللہ کو پکارتے: اللہ تو چاہتا تو یہ ایسے مخالف نہ ہوتے۔

حضرت ابوبکر اور حضرت علی بالعموم آپ کے ساتھ ہوتے۔ ایک روایت کے مطابق آپ اپنے چچا عباس کو بھی ساتھ لے کر گئے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کہتے ہیں: بائیکاٹ کے زمانہ میں بھی آپ ایام حج میں شعب ابوطالب سے نکل کر منیٰ، مجنہ اور عکاظ پہنچ جاتے (ترجمہ Le Prophete de l'islam: ص ۱۳۱)۔ آپ کا یہ عمل دعوت اس قدر متواتر اور مشہور تھا کہ ایسا بھی ہوا کہ مصر و یمن سے کوئی حج کے سفر پر نکلا تو اس کے اعزہ و اہل وطن نے تنبیہ کی کہ قریش کا نوجوان تمھیں گم راہ نہ کرنے پائے (احمد، رقم ۱۴۴۵۶۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۰۱۲)۔

عام الحزن کے بعد

۱۰ر نبوی (۶۱۹ء): آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اپنے قبیلۂ قریش کی معاندانہ سرگرمیوں کے خلاف آپ کا دفاع کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مشرکوں کی ایذائیں بڑھ گئیں۔ آپ اپنے گھر کی کوٹھڑی یا کسی دیوار کی اوٹ میں نماز ادا کرنے لگے۔ جانوروں کی اوجڑیاں ڈالنا اور آپ کے گھر کوڑا پھینکنا تو

معمول تھا، ایک اوباش نے سر مبارک پر خاک ڈال دی۔ اپنے ہم وطنوں کی طرف سے دین اسلام کی دعوت میں رکاوٹیں ڈالنے اور اسے رد کیے جانے کے بعد آپ نے مکہ سے باہر دوسرے مقامات میں دعوت پیش کرنے پر غور فرمایا۔ اس سلسلے میں آپ کا پہلا انتخاب قریبی شہر طائف تھا۔ بعثت کے دسویں سال آپ حضرت زید بن حارثہ کو ساتھ لے کر اس سفر پر روانہ ہوئے۔ آپ نے بنو ثقیف کے سرداروں کو اللہ واحد پر ایمان لانے کی دعوت دی اور نصرت اسلام کا مطالبہ کیا، لیکن انھوں نے کہا: آپ کے شہر والوں نے آپ کی بات نہیں مانی تو آپ ہمارے پاس آ گئے ہیں۔ ہم ان سے زیادہ سخت جواب دیں گے۔ انتہائی بداخلاقی کا برتاؤ کرنے کے بعد انھوں نے آوارہ لونڈوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا، جنھوں نے پتھر مار مار کر آپ کے قدم مبارک لہولہان کر دیے۔

دعوت قبائل جاری رہی

۱۱/ نبوی: مکہ اور طائف کے مشرکوں سے مایوس ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موسم میں منیٰ، عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ یمن کے بڑے قبیلے کندہ کے خیموں میں آئے اور ان کے سردار ملیح کو دعوت دی، لیکن اس نے شایستگی کے ساتھ انکار کر دیا۔ پھر آپ بکر بن وائل کے ڈیرے پر تشریف لائے۔ انھوں نے بتایا: ہم ایران کے پڑوسی ہیں، اس کا مقابلہ کرتے ہیں نہ اس کے خلاف کسی کی مدد کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم اللہ کی تسبیح وحمد کرو تو ان کے گھروں کے مالک بن جاؤ گے اور ان کی عورتوں سے شادیاں کرو گے۔ انھوں نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں۔ آپ کے جانے کے بعد ابولہب پہنچ گیا اور کہا: اس کی بات پر دھیان نہ کرنا، یہ پاگل ہے۔ آپ بنو کلب کے بطن بنو عبد اللہ کے ڈیرے میں پہنچے اور فرمایا: اللہ نے تمھارے باپ کو اچھا نام دیا ہے، انھوں نے بھی دعوت دین قبول نہ کی۔ آپ بنو حنیفہ کی قیام گاہ تشریف لائے، ان کا رد عمل عربوں میں بدترین تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عامر بن صعصعہ سے رابطہ کیا۔ وہ ایمان تو نہ لائے، تاہم کار رسالت میں اس شرط پر آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا کہ انھیں بعد میں خلیفہ بنایا جائے۔ آپ نے فرمایا: یہ تو اللہ کا اختیار ہے۔ ان کے سردار بیحرہ (بحیرہ) بن فراس قشیری نے کہا: آپ کا ساتھ دے کر اپنی گردنیں ہم کٹوائیں اور حکومت کے مزے دوسرے لوٹیں۔ اپنی قوم سے اس نے کہا: اس شخص کو جسے اس کی قوم نے جھٹلا دیا ہے، پناہ دے کر ہم تمام عرب سے جنگ کیوں مول لیں۔ آپ واپس جانے کے لیے اونٹنی پر سوار ہوئے تو اس خبیث نے اونٹنی کے پہلو میں ٹھوکا دیا۔ وہ اچھلی اور آپ کو نیچے گرا دیا۔ وہاں پر موجود حضرت ضباعہ بنت عامر کی تحریک پر بنو عامر کے تین جوان اٹھے اور بیحرہ

اور اس کے دو ساتھیوں کو گرا کر ان کے چہروں پر تھپڑوں کی برسات کر دی۔ اوس کی شاخ بنو عمرو بن عوف کے سردار سوید بن صامت حج یا عمرہ کرنے آئے تو آپ نے ان سے ملاقات کی اور اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا: میرے پاس لقمان کا نصیحت نامہ ہے، ہو سکتا ہے آپ کے پاس ویسا ہی پند نامہ ہو۔ آپ نے ان کا مجلہ سن کر قرآن کی تلاوت فرمائی تو انھوں نے تحسین کی، عام خیال ہے کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ آپ نے بنو عبد الاشہل کے ابو الحیسر انس بن رافع کو بھی توحید کی دعوت دی، اس نے کہا: ہم تو اپنے دشمنوں کے خلاف قریش کو حلیف بنانے آئے تھے، الٹا ان کی عداوت مول لے کر واپس چلے جائیں۔ البتہ اس قبیلے کا نوجوان ایاس بن معاذ مسلمان ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات بنو شیبان بن ثعلبہ کے مفروق بن عمرو، ہانی بن قبیصہ اور مثنیٰ بن حارثہ سے ہوئی۔ مفروق نے کہا: برادر قریش، آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ آپ نے یہ آیت قرآنی تلاوت فرمائی:

قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔـا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَاِيَّاهُمۡ ۚ وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَـقِّ ؕ ذٰلِكُمۡ وَصّٰٮكُمۡ بِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ.

(الانعام ۶:۱۵۱)

”کہہ دیجیے، آؤ میں تمھیں پڑھ کر سناؤں جو تم پر تمھارے رب نے حرام کیا، وہ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور مفلسی کے باعث اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم تمھیں اور انھیں سب کو رزق دیں گے اور ظاہری و باطنی بے حیائیوں کے پاس نہ جاؤ اور جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے ناحق نہ مارو۔ تمھیں یہ نصیحت کی ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ۔“

مفروق یہ سن کر بہت متاثر ہوا اور کہا: واللہ، یہ کلام اہل زمین میں سے کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اب ہانی بولا: ہم آپ کی باتوں کو سچ جانتے ہیں، لیکن اپنی قوم کی مرضی کے خلاف کوئی عہد نہیں کر سکتے۔ ہانی نے عہد صدیقی میں بھی اسلام قبول کرنے کے بجائے جزیہ دینے کو ترجیح دی، لیکن حضرت عمر کے دور خلافت میں وہ مسلمان ہو گیا (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۴۰۷۴، ۱۸۶۴۷)۔ ان کے تیسرے ساتھی مثنیٰ بن حارثہ نے کہا: ہم عرب اور ایران کے درمیان رہتے ہیں، ایران کی جانب تو نہیں، البتہ عرب میں آپ کی نصرت و حمایت کر سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اللہ کے دین کا ساتھ وہی دے سکتا ہے جو تمام اطراف کا احاطہ کرے۔ کچھ ہی دیر کی بات ہے کہ اللہ ایرانیوں کا ملک اور دولت تمھیں عطا کر دے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عبس، بنو سلیم، بنو غسان، بنو محارب، بنو نضر، بنو مرہ، بنو عذرہ، بنو ثعلبہ

اور حضرمی قبائل کو ایک ایک کر کے اللہ واحد پر ایمان لانے کی دعوت دی، مگر کسی نے قبول نہ کی۔ ان کا جواب تھا: آپ کا کنبہ اور قبیلہ آپ کو بہتر جانتا تھا، انھوں نے بھی آپ کی پیروی نہیں کی۔ یثرب کا ایک شخص قیس بن خطیم قرآن کی تلاوت سن کر متاثر ہوا۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سال کی مہلت مانگی، لیکن اسے اجل نے آن لیا۔ بیہقی نے اس سے ملتا جلتا واقعہ ایک ہمدانی کی طرف منسوب کیا ہے۔ پھر اللہ کا کرنا ہوا کہ آپ کی ملاقات یثرب سے آنے والے زائرین خزرج سے ہوئی، جب وہ اپنے سر منڈا رہے تھے۔

دس سالہ تبلیغ مسلسل کا ثمرہ

۱۱/ نبوی کے حج میں آپ منیٰ کی گھاٹی (عقبہ) میں تشریف فرما تھے کہ قبیلۂ خزرج کے چھ آدمی آپ کے پاس آئے۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا آپ یہودیوں کے حلیف ہیں؟ آپ بیٹھیں گے کہ میں آپ سے کچھ باتیں کرلوں۔ آپ نے آیات قرآنی تلاوت کر کے انھیں اسلام کی دعوت دی۔ یثرب کے اوس و خزرج قبائل بت پرست تھے، مگر انھوں نے اپنے ہمسایہ یہودیوں سے سن رکھا تھا کہ نبی آخر الزماں کا ظہور ہونے والا ہے۔ یہودی ان کو دھمکیاں دیا کرتے تھے کہ ہم آخری نبی کے لشکر میں شامل ہو کر تم بت پرستوں کو عاد و ارم کی طرح نیست و نابود کر ڈالیں گے۔ کلام الٰہی سن کر یہ لوگ بے حد متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ یہودی جن خاتم النبیین کی خوش خبری دیتے رہے ہیں، یقیناً یہی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہودی ہم سے پہلے اسلام کی دعوت قبول کرلیں۔ یہ کہہ کر سب ایک ساتھ ایمان لے آئے اور توقع کی کہ اگر یثرب کی ساری قومیں اوس اور خزرج آپ کی دعوت قبول کرلیں تو ان کی باہمی دشمنیاں ختم ہو جائیں۔ ان چھ خوش نصیبوں کے نام یہ ہیں: بنونجار کے حضرت اسعد بن زرارہ اور حضرت عوف بن الحارث (ابن عفراء)، بنوزریق کے حضرت رافع بن مالک، بنوسلمہ کے حضرت قطبہ بن عامر، بنوحرام (بنوغنم: ابن اثیر) کے حضرت عقبہ بن عامر اور بنوعبید بن عدی (بنوعبیدہ: ابن اثیر) کے حضرت جابر بن عبداللہ بن رئاب۔ یثرب جا کر انھوں نے اپنے اہل خاندان اور رشتہ داروں کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ ابن اثیر نے ساتویں صاحب بنوزریق کے حضرت عامر بن عبد حارثہ کے نام کا اضافہ کیا ہے (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۷۲۳۸)۔ عروہ بن زبیر اور ابن سعد نے یثرب کے ان 'السٰبقون الأولون' کی تعداد آٹھ بتائی ہے: حضرت معاذ بن عفرا، حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت رافع بن مالک، حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت یزید بن ثعلبہ، حضرت ابوالہیثم بن تیہان اور حضرت عویم بن ساعدہ (مستدرک حاکم، رقم ۵۲۴۹)۔

بیعت عقبۂ اولیٰ

۱۲/ نبوی (جولائی ۶۲۱ء): کے حج میں یثرب کے بارہ اصحاب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی۔ مکہ سے منیٰ آتے ہوئے کوہ ثبیر کی ایک گھاٹی (عربی: عقبہ) سے گزرنا پڑتا ہے۔ جمرۂ اولیٰ یا جمرۂ عقبہ یہیں واقع ہے، جب کہ باقی دو جمرے اور منیٰ کا میدان مشرق کی سمت میں ہیں۔ رمی جمرات کے بعد حاجیوں کا ہجوم یہاں سے چھٹ جاتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لینے کے لیے اس گھاٹی کو منتخب فرمایا۔ ۱۴۴ھ میں ابوجعفر منصور نے یہاں مسجد عقبہ تعمیر کرائی اور اب پہاڑ کاٹ کر کشادہ سڑکیں نکال لی گئی ہیں۔

بیعت عقبہ میں شامل پانچ اصحاب حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت عوف بن الحارث، حضرت رافع بن مالک، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت قطبہ بن عامر کے ساتھ سات مزید اہل ایمان بھی اس بیعت میں شامل ہوئے، ان کے نام ہیں: بنو نجار کے حضرت معاذ (معوذ: بلاذری، ابن جوزی) بن حارث، بنو زریق کے حضرت ذکوان بن عبد قیس، بنو عوف کے حضرت عبادہ بن صامت اور ان کے حلیف حضرت ابو عبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہ، بنو سالم کے حضرت عباس بن عبادہ، بنو عبد الاشہل کے حضرت ابوالہیثم مالک بن تیہان اور بنو عمرو بن عوف کے حضرت عویم بن ساعدہ۔ حضرت ابوالہیثم اور حضرت عویم اوس سے تھے، جب کہ باقی دس صحابہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ انصار کے ان بارہ 'السّٰبقون الأولون' کی بیعت ایمان بیعت عقبۂ اولیٰ کہلاتی ہے۔

آپ نے سورۂ بقرہ کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ. (البقرہ ۲: ۱۲۶)

"اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی: اے رب، تو اس کو امن کا شہر بنادے اور اس میں رہنے والوں کو جو ان میں سے اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں، ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔ فرمایا: جو کفر کریں گے میں انھیں بھی تھوڑا فائدہ دوں گا، پھر انھیں آگ کے عذاب کی طرف دھکیلوں گا، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔"

عقبۂ اولیٰ کی رات بیعت کرنے والے ایک انصاری صحابی حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ، اس بات پر میری بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ گے،

چوری نہ کروگے، زنا نہ کروگے، اپنی اولاد کو قتل نہ کروگے، اپنے ہاتھوں پاؤں کے درمیان (اعضاے صنفی) سے متعلق کوئی بہتان نہ تراشوگے اور معروف میں میری نافرمانی نہ کروگے۔ تم میں سے جو عہد پورا کرے گا، اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہوگا اور جس نے ان میں سے کوئی عہد شکنی کی اور اللہ نے اس کا پردہ رکھا تو اس کا فیصلہ اللہ کرے گا، چاہے سزا دے، چاہے معاف کر دے (بخاری، رقم ۱۸۔ احمد، رقم ۲۲۷۵۴۔ مسند شاشی، رقم ۱۱۵۰)۔

اسے بیعت النساء کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ جنگ فرض ہونے سے پہلے لی گئی اور اس کے الفاظ اس بیعت سے ملتے ہیں جو صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہونے والے اس حکم ربانی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے لی:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (الممتحنہ ۶۰: ۱۲)

”اے نبی، جب آپ کے پاس مومنہ عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ وہ نہ تو اللہ کے ساتھ کچھ شریک کریں گی، نہ چوری کریں گی، نہ زنا کریں گی، نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (اعضاے مخصوصہ) سے متعلق کوئی بہتان تراشیں گی (یعنی کوئی جنسی تہمت لگانا یا مولود کا نسب غلط بتانا)، نہ کسی معروف بات میں آپ کی نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لیجیے اور ان کے لیے اللہ سے بخشش مانگیں۔ بے شک، اللہ بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“

دوسری روایت میں خزرج کے نو اصحاب: حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت سعد بن ربیع، حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت رافع بن مالک، حضرت براء بن معرور، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت منذر بن عمر، حضرت عبادہ بن ثابت اور اوس کے تین صحابہ: حضرت اُسید بن حضیر، حضرت سعد بن خیثمہ، حضرت ابوالہیثم بن تیہان کے نام بتائے گئے ہیں۔

اسلام کے پہلے سفیر اور معلم

بیعت عقبۂ اولیٰ کے بعد حضرت اسعد بن زرارہ مدینہ میں نماز اور جمعہ پڑھاتے رہے، بنو بیاضہ کی سنگلاخ

زمین ہزم النبیت میں خضمات (ہضبات: طبرانی) نامی میدان یا باغ میں انھوں نے عہد اسلامی کا پہلا جمعہ پڑھایا جس میں چالیس مسلمان شریک ہوئے (ابن ماجہ، رقم ۱۰۸۲۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۰۳۹۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۵۶۰۵۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۵۵۲۵۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۰۱۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۶۸۹۶)۔ انصار نے پھر حضرت معاذ بن عفرا اور حضرت رافع بن مالک کو اس درخواست کے ساتھ آپ کے پاس دوبارہ بھیجا کہ ہمارے ساتھ ایسا کوئی شخص بھیجیں جو ہمیں دین سکھائے اور قرآن پڑھائے۔ آپ نے حضرت مصعب بن عمیر کا انتخاب کیا اور انھیں حکم دیا کہ اسلام کی طرف لپکنے والے اہل یثرب کو قرآن سکھائیں، شرائع اسلام کی تعلیم دینے کے ساتھ ان میں دین کی سوجھ بوجھ (تفقہ) پیدا کر دیں۔ حضرت مصعب حضرت اسعد بن زرارہ کے مہمان ہوئے۔ وہ انصار کے گھروں اور قبائل میں جاتے، ان کی کوششوں سے خزرج کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں رسول پاک کا ذکر نہ پہنچا ہو، انھیں قاری (قرآن پڑھنے والا) اور مقری (قرآن پڑھانے والا) کہا جانے لگا۔ یثرب میں ان کے ہاتھوں مسلمان ہونے والوں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی۔ حضرت مصعب نماز کی امامت بھی کرتے، اس کے باوجود ان کی سرگرمیاں خفیہ رہیں۔ ایک روایت کے مطابق مدینۂ منورہ میں پہلا جمعہ حضرت مصعب بن عمیر نے پڑھایا۔

حضرت مصعب بن عمیر کے ہاتھ پر ایمان لانے والے چند انصاری مسلمان: حضرت محمد بن مسلمہ، حضرت عباد بن بشر، حضرت اسید بن حضیر، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت سعد بن معاذ۔

حضرت اسید اور حضرت سعد بن معاذ کا قبول اسلام

بنو عبدالاشہل کے سردار سعد بن معاذ کو حضرت مصعب کے آنے کی خبر ہوئی تو اسید بن حضیر کو بھیجا۔ وہ غصے سے بھالا لے کر پہنچے اور حضرت مصعب سے کہا: تم ہمارے نادان لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہو۔ حضرت مصعب نے کہا: آپ ذرا بیٹھ کر سن لیں۔ اگر بات بھلی لگے تو قبول کر لیجیے گا، پسند نہ آئے تو نہ مانیے گا۔ اسید بولے: تم نے انصاف کی بات کی۔ حضرت مصعب نے اسلام کے بارے میں بتایا اور قرآن کی تلاوت کی تو ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے، انھوں نے غسل کیا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ پھر کہا: میں اپنے ایک ساتھی کو بھیجتا ہوں، اس نے تمھاری پیروی کر لی تو اس کی قوم میں سے کوئی پیچھے نہ رہے گا۔ اسید کے جانے کے بعد سعد بن معاذ آئے، حضرت مصعب نے انھیں بھی بیٹھ کر بات سننے کو کہا، انھوں نے یہ آیات تلاوت کیں:

حٰمٓ. وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ. اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ. (الزخرف ۴۳: ۱-۳)

”یہ ’حٰمٓ‘ ہے۔ شاہد ہے یہ واضح کتاب۔ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھو۔“

قرآن مجید کی تلاوت سننے کے بعد ان کے چہرے میں چمک پیدا ہوئی اور وہ فی الفور مسلمان ہو گئے۔ پھر اپنی قوم میں پہنچے اور اعلان کر دیا: جس کو شک ہو، اس سے بہتر راہ ہدایت لے آئے۔ جب تک تم اللہ ورسول پر ایمان نہ لاؤ، کسی مرد و عورت سے گفتگو کرنا میرے لیے حرام ہے۔ عبدالاشہل کے تمام مردوں عورتوں نے اس پکار پر لبیک کہا اور اسی وقت ایمان لے آئے۔

حضرت مصعب، حضرت اسعد بن زرارہ کے گھر میں مقیم رہے، لیکن جب بنو نجار کی مخالفت بڑھ گئی تو وہ حضرت سعد بن معاذ کے ہاں منتقل ہو کر اسلام کی تبلیغ کرتے رہے، یہاں تک کہ انصار کا کوئی گھر باقی نہ بچا جس میں چند مرد اور عورت مسلمان نہ ہو چکے ہوں (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۷۲۳۸)۔ صرف بنی امیہ بن زید، خطمہ، وائل اور واقف کے گھر اسلام سے محروم رہ گئے۔ بنو واقف کے شاعر اور سردار ابو قیس بن اسلت صیفی نے انھیں اسلام قبول کرنے سے روک لیا۔ جنگ خندق (۵ھ) تک وہ دین شرک پر قائم رہے۔ ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ ابو قیس نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن واقدی کی روایت کے مطابق اس کی موت کفر پر ہوئی۔

یثرب کے مشرک قیس بن عبید کی اہلیہ حضرت حوا بنت زید نے اسلام قبول کیا تو قیس نے ان کو نشانۂ اذیت بنانا شروع کر دیا۔ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہو گئی۔ چنانچہ قیس جب اپنے مشرک ساتھیوں کے ساتھ حج کے لیے آیا تو آپ نے اسے بلا کر اپنی بیوی کو ستانے سے منع فرمایا۔ گھر لوٹ کر اس نے کہا: میں ایک خوب رو اور اچھی وضع قطع والے صاحب سے مل کر آیا ہوں۔ تم اپنے دین پر عمل کرتی رہو۔

ایک روایت کے مطابق قریش نے رات کے وقت جبل ابو قبیس پر کسی کو یہ شعر کہتے سنا:

فإن يسلم السعدان يصبح محمد

بمكة لا يخشى خلاف المخالف

”اگر دو سعد، یعنی سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ ایمان لے آئیں تو مکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کسی مخالف کا ڈر نہ ہو گا۔“

[باقی]

ڈاکٹر عرفان شہزاد

زنا کی حرمت کی بنیاد

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

زنا کی حرمت کی بنیاد خاندان کے ادارے کا تحفظ ہے۔ خاندان کا ادارہ انسان کی ضرورت ہے۔ ناتواں بچے کی نگہداشت اور بڑھاپے کی لاچارگی میں انسان کی دیکھ بھال نسبی تعلقات کی فطری محبت اور توجہ کے بنا کماحقہٗ ممکن نہیں ہوتی۔ مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق کو انھی کی بقا اور دیکھ بھال کی خاطر خاندان کو وجود پذیر کرنے کا سبب بنایا گیا ہے۔ اس کے تحفظ کے لیے ضروری ٹھیرا کہ اس تعلق کو شوہر اور بیوی کے درمیان محدود کر دیا جائے۔ ان کی جنسی دل چسپی گھر سے باہر بھی بھٹکتی رہی تو بچوں کی صحت مند پرورش کے لیے درکار توجہ دست یاب نہیں ہو سکتی۔ خاندان کا ادارہ برقرار نہ رہے تو فرد بے یار و مددگار ہو کر رہ جائے۔ ان ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے شوہر اور بیوی کی آپس کی وفاداری کو رشتۂ نکاح کی لازمی قدر باور کرایا گیا، بلکہ جنسی بے قیدی کو غیر پاکیزہ (فاحشہ) قرار دے دیا۔ جنسی رویے کی اس تہذیب کو یقینی بنانے کے لیے نکاح سے پہلے بھی جنسی تعلق قائم کرنے کی ممانعت کی گئی، بلکہ اسے قابل سزا جرم قرار دیا گیا، کیونکہ یہ نکاح کے بعد شریک حیات اور بچوں کی حق تلفی کی بنیاد بن سکتا ہے۔

زنا بچوں کی حق تلفی کا باعث بنتا ہے۔ اُن بچوں کی حق تلفی کا باعث بھی جو نکاح کے تعلق سے وجود میں آئے، مگر انھیں اپنے باپ یا ماں یا دونوں کی جنسی آزادروی کی وجہ سے ان کی مکمل توجہ میسر نہیں آسکتی، اور اُن

بچوں کی حق تلفی کا باعث بھی جو زنا کے تعلق سے وجود میں آئے اور انھیں ان کے والدین کی مستقل توجہ اور احساس ذمہ داری میسر نہیں آسکتی، کیونکہ ان کے ماں اور باپ کے درمیان مستقل رفاقت کے ارادے سے باندھا گیا معاہدۂ نکاح نہیں ہوتا۔

مستقل رفاقت کے ارادے کی شق کے بغیر نکاح، درحقیقت نکاح ہی نہیں، کیونکہ اس میں ممکنہ طور پر وجود پذیر ہونے والے بچوں کو ماں اور باپ، دونوں کی باہمی نگہداشت کی ضمانت دست یاب نہیں ہوتی۔ نکاح متعہ کی حرمت کی یہی حقیقت ہے۔

اسی چیز کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ. (النساء ۴: ۲۴)

”اور اِن کے ماسوا جو عورتیں ہیں، (اُن کا مہر ادا کرکے) اپنے مال کے ذریعے سے اُنھیں حاصل کرنا تمھارے لیے حلال ہے، اِس شرط کے ساتھ کہ تم پاک دامن رہنے والے ہو، نہ کہ بدکاری کرنے والے۔“

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ. (النساء ۴: ۲۵)

”سو اُن (لونڈیوں) کے مالکوں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کر لو اور دستور کے مطابق اُن کے مہر بھی اُن کو دو، اِس شرط کے ساتھ کہ وہ پاک دامن رہی ہوں، بدکاری کرنے والی اور چوری چھپے آشنائی کرنے والی نہ ہوں۔“

’احصان‘ کسی کو اپنی حفاظت میں لینے یا کسی کی حفاظت میں آجانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ نکاح میں دوسرے فریق کی ذمہ داری اٹھا لینے یا اس کی ذمہ داری میں آجانے کا نام ہے۔ ’مسافحت‘ کے معنی عیاشی اور بدکاری کے ہیں۔ زنا اور متعہ، دونوں میں یہی مقصود ہوتا ہے، لیکن مستقل ذمہ داری کا معاہدہ نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر یہ حرام ہیں، جب کہ نکاح ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔

بچوں کی پیدایش کے امکان کو اگر معدوم کر بھی لیا جائے تو بھی وقتی نکاح یا نکاح کے بغیر جنسی تعلق جائز قرار نہیں پاتا، اس لیے کہ اِنھی مرد و عورت نے کبھی نہ کبھی مستقل رفاقت کے ارادے سے گھر بسانا ہے۔ چنانچہ خاندان کے تحفظ کا وہی سوال یہاں پھر لوٹ آتا ہے۔

ایسے افراد جو اولاد کی خواہش نہ رکھتے ہوں، انھیں بھی جنسی آزادروی کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اس لیے کہ اول تو ایسے لوگ مستثنیات ہوتے ہیں، اور عمومی قوانین مستثنیات کو مد نظر رکھ کر نہیں بنائے جاتے، ان کے لیے بھی عمومی قوانین کی پابندی کرنا لازم ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص جو آج بچوں کی خواہش نہیں رکھتا، کل یہ خواہش کرے اور گھر بسانا چاہے۔

صدقہ

"...اللہ کی راہ میں انفاق کا ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال میں سے فرض زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں سے زیادہ جو کچھ ہو، اُسے معاشرے کا حق سمجھے اور جب کوئی مطالبہ سامنے آئے تو اُسے فراخ دلی کے ساتھ پورا کر دے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کو دبا کر اور اپنی ضرورتوں میں ایثار کر کے بھی وہ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہی وہ چیز ہے جسے قرآن نے 'وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'، "اور اُنھیں اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، خواہ اپنی جگہ خود ضرورت مند ہوں" (الحشر ۵۹: ۹) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ صدقہ دینے والوں کی تعبیر اِن سب صورتوں کو شامل ہو سکتی ہے، لیکن بیان اوصاف کے موقع پر جب کسی شخص کو 'مُتَصَدِّق' کہا جائے گا تو اِس سے اشارہ اصلاً اُس کے درجۂ کمال کی طرف ہو گا۔ یعنی جو سخی اور فیاض ہو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دے۔ بندوں کے تعلق سے یہ اُسی خشوع کا ظہور ہے جو اِس سے پہلے مذکور ہے۔ نماز اور انفاق کا ذکر قرآن میں اِسی بنا پر ساتھ ساتھ آتا ہے۔" (جاوید احمد غامدی، میزان ۲۵۵)

مشفق سلطان

ہندو مت اور تصور نبوت؟

(۳)

گذشتہ سے پیوستہ

قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید کی روشنی میں اس تصور کو سمجھنے کے لیے ہمیں نبوت اور رسالت کے تصور کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

نبوت و رسالت

اپنی تصنیف ''میزان'' میں جاوید احمد غامدی صاحب رقم طراز ہیں:

''خدا کے جو پیغمبر اِس دین کو لے کر آئے، اُنھیں ''نبی'' کہا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے بعض ''نبوت'' کے ساتھ ''رسالت'' کے منصب پر بھی فائز ہوئے تھے۔

''نبوت'' یہ ہے کہ بنی آدم میں سے کوئی شخص آسمان سے وحی پا کر لوگوں کو حق بتائے اور اُس کے ماننے والوں کو قیامت میں اچھے انجام کی خوش خبری دے اور نہ ماننے والوں کو برے انجام سے خبر دار کرے۔ قرآن اِسے ''انذار'' اور ''بشارت'' سے تعبیر کرتا ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ، مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ. (البقرہ ۲: ۲۱۳)

''لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر (اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے۔''

''رسالت'' یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کوئی شخص اپنی قوم کے لیے اِس طرح خدا کی عدالت بن

کر آئے کہ اُس کی قوم اگر اُسے جھٹلا دے تو اُس کے بارے میں خدا کا فیصلہ اِسی دنیا میں اُس پر نافذ کر کے وہ حق کا غلبہ عملاً اُس پر قائم کر دے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ، فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (یونس ۱۰:۴۷)

”(اُس کا قانون یہی ہے کہ) ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آ جاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔“

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ، اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ. كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ. (المجادلہ ۵۸: ۲۰-۲۱)

”(تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول سے دشمنی کریں گے، وہی سب سے بڑھ کر ذلیل ہونے والوں میں ہوں گے۔ اِس لیے کہ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب ہو کر رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑے زور والا اور بڑا زبردست ہے۔“

رسالت کا یہی قانون ہے جس کے مطابق خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. (الصف ۶۱:۹)

”وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ (اِس سرزمین کے) تمام ادیان پر اُس کو غالب کر دے، خواہ یہ مشرکین بھی اِسے کتنا ہی ناپسند کریں۔“

اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتا اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا میں برپا کر دیتا ہے۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور اِس سے انحراف کریں گے تو اِس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔“ (میزان ۷۱-۷۲)

درج بالا اقتباس کی رو سے:

۱۔ نبوت کا منصب عام ہے اور رسالت کا منصب خاص ہے۔

۲۔ رسول اپنی قوم کی طرف خدا کی عدالت بن کر آتا ہے۔ رسول کے ساتھ خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں حق کا غلبہ قائم ہو جاتا ہے اور رسول کے دشمن لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں۔

۳۔ لوگ خدا کو گویا رسول کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ 'اظہار دین' کے مقصد کے لیے بھیجتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ رسول کے ذریعے سے 'قیامت کبریٰ' سے پہلے 'قیامت صغریٰ' برپا کرتا ہے۔

صاحب ''تدبر قرآن'' مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ' کا صحیح موقع و محل اور اس کا اصلی زور سمجھنے کے لیے یہاں بالاجمال اس سنت اللہ کو سمجھ لینا ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے باب میں پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول اس قوم کے لیے خدا کی آخری اور کامل حجت ہوتا ہے۔ جس کے بعد کسی مزید حجت و برہان کی اس قوم کے لیے ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی بلکہ تکذیبِ رسول اور عداوتِ حق ہی پر اڑی رہ جاتی ہے تو وہ فنا کر دی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی عذاب کے ذریعہ سے فنا ہو یا حق کے اعوان و انصار اور رسول کے ساتھیوں کے ہاتھوں اور عام اس سے کہ یہ واقعہ رسول کی زندگی ہی میں ظہور میں آئے یا اس کی وفات کے بعد۔ 'لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا' اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے اور اس کے ظہور کے لیے قرآن میں ایک مخصوص ضابطہ بیان ہوا ہے...۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۴۷۸)

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا اعلان فرمایا ہے جو ازل سے اس نے لکھ رکھی ہے کہ جو کشمکش اللہ ورسول اور حزب الشیطان کے درمیان برپا ہو گی اس میں غلبہ اللہ اور اس کے رسولوں کو حاصل ہو گا، شیطان کی پارٹی ذلیل و خوار ہو گی۔ اس سنت اللہ کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ رسول جتنے بھی دنیا میں آئے وہ جس قوم کے اندر آئے اس کے لیے خدا کی عدالت بن کر آئے۔ اس کے بعد اس قوم کا لازماً فیصلہ ہو گیا۔ اگر قوم نے بحیثیت مجموعی رسول کی تکذیب کر دی تو اس کے اندر سے رسول اور اس پر ایمان لانے والے افراد کو الگ کر کے باقی قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی عذاب کے ذریعہ سے فنا کر دیا۔ اور اگر ایمان لانے والوں کی تعداد معتد بہ ہوئی تو اتمام حجت کے بعد اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ جہاد کے لیے تلوار اٹھائیں اور ان اعدائے حق سے مقابلہ کر کے ان کا زور توڑ دیں کہ زمین ان کے فتنہ سے پاک ہو جائے۔ قرآن نے رسولوں کی جو تاریخ پیش کی ہے ان میں سے اکثر کو پہلی صورت پیش آئی یعنی رسول اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد قوم پر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کن عذاب آ گیا۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں دوسری صورت پیش آئی کہ

ہجرت کے بعد آپ کو جہاد کا حکم ہوا اور آپ کے اعداء نے آپ کے صحابہؓ کی تلوار سے شکست کھائی یہاں تک کہ ان کا بالکل قلع قمع ہو گیا۔" (تدبر قرآن ۸/۲۷۳)

درج بالا اقتباسات سے جو اضافی باتیں واضح ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ رسول کی قوم کے لیے خدا تعالیٰ کی عدالت کا ظہور رسول کے ذریعے سے 'اتمام حجت' کے بعد ہوتا ہے۔ اتمام حجت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ علم و عقل کی شہادت کے بعد رسولوں کے ذریعے سے ایک دوسری شہادت بھی پیش کر دی جائے جو حق کو اس درجہ واضح کر دے کہ کسی کے پاس انکار کرنے کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔

۲۔ رسول کے منکرین پر خدا تعالیٰ کا عذاب یا تو قدرتی آفات کے ذریعے سے آتا ہے یا پھر اہل حق کے ہاتھوں سے۔

۳۔ دوسری صورت کا عذاب صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں پیش آیا۔

یہ بات بھی قرآن مجید سے واضح ہے کہ جو عذاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کے منکرین پر آتا ہے، خاص طور پر قدرتی آفات کے ذریعے سے آنے والا عذاب، اسے فرشتے ہی نافذ کرتے ہیں۔ سیدنا لوط علیہ السلام کی سرگذشت میں اس کا تذکرہ موجود ہے[15]۔ فرشتوں کا خدا کی جزا و سزا کا آلۂ کار بننے کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ. (الانعام ۶:۸)

"کہتے ہیں کہ اِس نبی پر (علانیہ) کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ (یہ احمق نہیں سمجھتے کہ) اگر ہم نے کوئی فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک فیصلہ ہو جاتا، پھر اِن کو کوئی مہلت نہ ملتی۔"

رسول کے ساتھیوں کے ہاتھوں سے منکرین و معاندین کو دیے جانے والے عذاب میں بھی فرشتوں کا کردار قرآن مجید میں نمایاں کیا گیا ہے۔ نیز سورۂ آل عمران اور سورۂ انفال میں اس کی صراحت موجود ہے۔ رسولوں کی قوموں کے لیے خدا تعالیٰ کی عدالت کے ظہور میں فرشتوں کے کردار کا مطالعہ اور اس کی روشنی میں ہندو کتابوں میں متعلقہ مقامات کا تجزیہ ہم ایک الگ مضمون میں کریں گے۔

بھگود گیتا میں اوتار کے لیے جن الفاظ و اسالیب کا استعمال ہوا ہے، اب ہم ان کا موازنہ قرآن مجید میں مستعمل

۱۵۔ دیکھیے: سورۂ ہود ۱۱: ۶۹-۷۷۔ سورۂ حجر ۱۵: ۵۸-۶۰۔ سورۂ ذاریات ۵۱: ۳۲-۳۴۔

الفاظ و اسالیب سے کر لیتے ہیں۔

قرآن مجید کے اسالیب

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی دینونت کے ظہور کے لیے جو اسالیب استعمال ہوئے ہیں، ان میں کبھی اللہ تعالیٰ کے آنے کی بات ہے، کبھی فرشتوں کے آنے کی اور کبھی اس کے فیصلے کے آنے کی۔ چند آیات غور طلب ہیں:

هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ وَقُضِىَ الۡاَمۡرُ‌ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ. (البقرہ۲:۲۱۰)

”(اس اتمام حجت کے باوجود) کیا یہ اِسی کے منتظر ہیں کہ اللہ اور اُس کے فرشتے بدلیوں کے سایے میں اِن پر نمودار ہو جائیں اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے؟ (لیکن یہ اللہ کا طریقہ نہیں ہے) اور اِس طرح کے معاملات تو اللہ ہی کے حوالے ہیں۔“

هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ رَبُّكَ اَوۡ يَاۡتِىَ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ‌ؕ يَوۡمَ يَاۡتِىۡ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنۡفَعُ نَفۡسًا اِيۡمَانُهَا لَمۡ تَكُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ اَوۡ كَسَبَتۡ فِىۡۤ اِيۡمَانِهَا خَيۡرًا‌ؕ قُلِ انۡتَظِرُوۡۤا اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ. (الانعام۶:۱۵۸)

”کیا وہ اِسی کے منتظر ہیں کہ اُن کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا پروردگار آجائے یا تیرے پروردگار کی نشانیوں میں سے کوئی خاص نشانی ظاہر ہو جائے؟ جس دن تیرے پروردگار کی نشانیوں میں سے (اِس طرح کی) کوئی نشانی ظاہر ہو جائے گی، اُس دن کسی ایسے شخص کو اُس کا ایمان کچھ نفع نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اپنے ایمان میں اُس نے کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔ کہہ دو کہ (اِسی پر اصرار کرتے ہو تو) انتظار کرو، ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔“

هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ اَمۡرُ رَبِّكَ‌ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ. (النحل۱۶:۳۳)

”کیا یہ اِسی کے منتظر ہیں کہ اِن کے پاس فرشتے آپہنچیں یا تیرے پروردگار کا فیصلہ صادر ہو جائے؟ اِن سے پہلے والوں نے بھی یہی کیا تھا۔ (پھر جو کچھ ہوا، وہ) اللہ نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ وہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔“

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا. (الحشر ۵۹: ۲)

”وہی ہے جس نے اہل کتاب کے منکروں کو پہلے حشر کے لیے اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا ہے۔ تمھیں گمان نہ تھا کہ وہ کبھی (اس طرح) نکلیں گے اور وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ اُن کے قلعے اُنھیں اللہ کے عذاب سے بچالیں گے۔ مگر اللہ اُن پر وہاں سے آپہنچا، جہاں سے اُنھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔“

درج بالا آیات میں مستعمل الفاظ کی وجہ سے ہمارے مفسرین کو خدا تعالیٰ کی ذات کے انتقال و حرکت وغیرہ کی بحثیں کر کے اس کی نفی کرنا پڑی ہے۔ مثلاً امام قرطبی سورۂ بقرہ کی آیات ۲۱۰ کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں:

قال الزّجاج: التقدير في ظلل من الغمام ومن الملائكة. وقيل: ليس الكلام على ظاهره في حقه سبحانه، وإنما المعنى يأتيهم أمر الله وحكمه. وقيل: أي بما وعدهم من الحساب والعذاب في ظُلَل مثل:﴿**فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا**﴾[الحشر: ۲]. (الجامع لاحكام القرآن ۲۵/۳)

”زجاج نے کہا ہے: تقدیر کلام اس طرح ہے: ’في ظلل من الغمام ومن الملائكة‘ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کے حق میں کلام اپنے ظاہر پر نہیں ہے، بلکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کا حکم ان کے پاس آجائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حساب و عذاب میں سے جس کا ان کے ساتھ وعدہ فرمار کھا ہے، اس کے ساتھ چھائے ہوئے بادلوں میں ان کے پاس آجائے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: ’فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا‘۔“

امام قرطبی آگے لکھتے ہیں:

لا يجوز أن يحمل هذا وما أشبهه مما جاء في القرآن والخبر على وجه الانتقال والحركة والزوال، لأن ذلك من صفات

”یہ جائز نہیں کہ اسے اور جو کچھ اس کے مشابہ قرآن و حدیث میں مذکور ہے، اسے وجہ انتقال، حرکت اور زوال پر محمول کیا جائے، کیونکہ یہ

الأجرام والأجسام، تعالى الله الكبير المتعال، ذو الجلال والإكرام عن مماثلة الأجسام عُلُوًّا كبيرًا.

(الجامع لاحکام القرآن ۲۶/۳)

اجرام و اجسام کی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے انتہائی بلند و برتر ہے۔ وہ ذو الجلال والاکرام ہے اور اجسام کی مماثلت سے بلند و بالا اور برتر ہے۔‘‘

کئی مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے آنے کو متشابہات میں سے مانا ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ اس پر اجمالی ایمان کافی ہے، تفصیل انسانوں کی عقل سے ماورا ہے۔ بعض نے ’يَأْتِيَ رَبُّكَ‘ وغیرہ جیسے الفاظ کے درمیان کوئی اور لفظ مثلاً ’امر‘ یا ’باس‘ مان کر معنی یہ کیے ہیں کہ اللہ کا حکم آ پہنچے یا عذاب آ جائے، اور پیچھے مذکور سورۂ نحل کی آیت میں لفظ ’امر‘ موجود بھی ہے۔

حدیث کی روشنی

عن أبي سعيد، وأبي هريرة، قالا: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”إن الله يمهل حتى إذا ذهب ثلث الليل الأول، نزل إلى السماء الدنيا، فيقول: هل من مستغفر؟ هل من تائب؟ هل من سائل؟ هل من داع؟ حتى ينفجر الفجر“. (مسلم، رقم ۱۷۷۲)

’’حضرت ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ ہر رات کو جب رات کا پہلا تہائی حصہ گزر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر اترتا ہے اور کہتا ہے: کون ہے جو مغفرت طلب کرے؟ کون ہے جو توبہ کرے، کون ہے جو مجھ سے مانگے؟ کون ہے جو دعا کرے؟ وہ برابر اسی طرح فرماتا رہتا ہے، یہاں تک کہ فجر روشن ہو جاتی ہے۔‘‘

اس روایت کا اصل منشا تو واضح ہے کہ رات کے ایک خاص حصے میں بندوں پر رحمت خداوندی کی خصوصی توجہ ہوتی ہے، جس سے خدا کے بندے عبادت اور دعا و مناجات میں گزار کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تاہم چونکہ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ’’خدا تعالیٰ سماء دنیا کی طرف نزول فرماتے ہیں‘‘، اس لیے اس حدیث میں بڑے کلامی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اہل علم کی ایک جماعت نے اس طرح کی روایت کے بارے میں کہا کہ یہ متشابہات میں سے ہیں، اگرچہ ’نزول‘ کے ظاہری معنی جو تشبیہ کو مستلزم ہیں، وہ مراد نہیں۔ متکلمین کا کہنا تھا کہ ان الفاظ کا ظاہری

مفہوم ہرگز مراد نہیں، لیکن ان کے مجازی معنی مراد ہیں، مثلاً 'نزول' سے مراد 'نزول رحمت' یا 'نزول ملائکہ' ہے۔ اس موضوع پر امام ابن تیمیہ کی ایک مستقل کتاب ہے جو ''شرح حدیث النزول'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ایک اور علمی زاویہ اس طرح کے الفاظ کو زبان و بیان کے فطری اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کا ہو سکتا ہے۔

تصور اوتار کی تفہیم قرآن مجید کی روشنی میں

پچھلی ساری بحث کی بنیاد پر اوتار کے تصور اور عقیدۂ رسالت کی 'اصلاحی و غامدی تفہیم' میں مماثلت نظر آتی ہے اور اوتار کے تصور کا عقیدۂ رسالت کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہونا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ تاہم کسی کے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اس تجزیہ کے بعد کیا ایک 'رسول' کو 'اوتار' کہا جا سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک یہ نتیجہ درست نہیں ہو گا۔ ہاں 'اوتار کے تصور' کا 'رسالت کے عقیدے' کے ساتھ تقابل میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ قرآن مجید کی رو سے دیکھا جائے تو اوتار کے تصور میں خدا کی ذات کا زمین پر نزول دراصل ایک خاص قانون کے تحت اس کے فیصلے یا عدالت کا ظہور ہے، نہ کہ ذات باری کی بشری و حیوانی صورت میں تشریف آوری۔ یوں، ایک رسول کو اوتار کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، بلکہ خدا تعالیٰ کے فیصلے کے نفاذ کو ہی خدا کا نزول قرار دیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی منو کی کہانی میں منو کو اوتار نہیں کہا گیا، بلکہ اس مچھلی کو اوتار کہا گیا جس نے منو کو پہلے طوفان کی خبر دی اور پھر ان کے ساتھیوں کے ہم راہ انھیں طوفان سے نجات بھی دی۔

ہماری تاریخ میں بعض اہل علم نے 'رسول' کو 'اوتار' بھی کہا ہے۔ مثال کے طور پر ابوریحان البیرونی (المتوفی ۱۰۵۰ء) نے کلمۂ طیبہ کا ترجمہ عربی سے سنسکرت میں یوں کیا تھا:

अव्यक्तमेक मुहम्मद अवतार[16]

''اویکت (ذات باری جو مخفی ہے) ایک ہے، محمد اوتار ہیں۔''

کلمۂ طیبہ کا یہ سنسکرت ترجمہ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں سرکاری سکوں پر درج کیا گیا۔ یہ سکے ذولسانی (bilingual) تھے، جن کی ایک جانب عربی عبارت اور دوسری جانب سنسکرت عبارت لکھی تھی۔[17]

۱۶- اَوْیَکْتَم ایکَ محمّدَ اَوَتار (avyaktameka Muhammada avatāra)

۱۷- Raza, S. Jabir. "COINAGE AND METALLURGY UNDER THE GHAZNAVID SULTAN MAHMUD." Proceedings of the Indian History Congress 75 (2014): 227–28. http://www.jstor.org/stable/44158383.

چند غور طلب پہلو

مضمون کے اس حصے میں ہم نے صرف بھگود گیتا کے متعلقہ مقام کو پیش نظر رکھا ہے۔ تاہم ہندو مت میں دھرم کی تفہیم و تشریح کے حوالے سے ویدوں کو اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے ان کا تجزیہ بھی ناگزیر ہے۔ لیکن اس کاوش کو پھر کسی مضمون کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ سوال بھی تحقیق طلب ہے کہ اگر اہل ہند اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر رسول کی شخصیت سے واقف ہیں تو عقیدۂ نبوت سے ان کے غیر مانوس ہو جانے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کی اہمیت کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے جس کے مطابق روزِ قیامت سیدنا نوح علیہ السلام کی امت اس بات ہی سے انکار کر دے گی کہ سیدنا نوح نے ان تک خدا کا کوئی پیغام پہنچایا تھا۔[۱۸] اس روایت کا تجزیہ بھی ان شاءاللہ کسی اور مضمون میں کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۸۔ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: ”يَجِيءُ نُوحٌ وَأُمَّتُهُ فَيَقُولُ اللهُ تَعَالَى: هَلْ بَلَّغْتَ؟ فَيَقُولُ: نَعَمْ، أَيْ رَبِّ. فَيَقُولُ لأُمَّتِهِ هَلْ بَلَّغَكُمْ؟ فَيَقُولُونَ: لاَ، مَا جَاءَنَا مِنْ نَبِيٍّ. فَيَقُولُ لِنُوحٍ: مَنْ يَشْهَدُ لَكَ؟ فَيَقُولُ: مُحَمَّدٌ صلى الله عليه وسلم وَأُمَّتُهُ، فَنَشْهَدُ أَنَّهُ قَدْ بَلَّغَ، وَهْوَ قَوْلُهُ جَلَّ ذِكْرُهُ: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾“ (بخاری، رقم ۳۳۳۹)۔

معاذ بن نور

اللہ کی معیت میں رہنا!!

انسان کے سامنے ہر وقت انتخاب (choices) آتے ہیں، اور ان انتخابوں میں وہ کس چیز کو ترجیح (priority) دیتا ہے، یہی اس کا مرکز توجہ (focus) ہوتا ہے۔ اگر میرے فوکس میں اللہ کی ذات ہے تو جب میرے سامنے کوئی بھی انتخاب آئے گا، میری ترجیح اللہ کی ذات ہو گی۔ اسی لیے میں مختلف انتخاب کروں گا۔ لیکن اگر میرا فوکس دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں اور میں انھیں اپنی ترجیح بناتا ہوں تو میری ترجیحات مختلف ہوں گی۔

یہ ویسے ہی ہے، جیسے آپ گاڑی کی سمت متعین کرتے ہیں، اور پھر گاڑی اس سمت میں چل نکلتی ہے۔ پھر اگر آپ ایک غلط انتخاب کرتے ہیں اور گاڑی کو نیچے ڈھلوان کی طرف موڑ دیتے ہیں تو اس کے بعد آپ مزید مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایک غلط انتخاب کو درست ثابت کرنے کے لیے مزید غلط انتخاب کریں۔ پھر ایک اور غلط انتخاب سامنے آتا ہے، اور یوں غلطیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ زوال کی راہ ہے۔

لیکن اگر آپ اللہ کو اپنی ترجیح بناتے ہیں اور نیک نیتی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں تو آپ بلندی کی طرف بڑھتے ہیں۔ آپ کے علم و عمل میں ایک طرح کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ چیزیں ہم اپنی زندگی میں محسوس کرتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنی زندگی میں ترجیح دے۔ یہ بلندی کا سفر ہے اور اس کے مختلف مراحل ہیں، جیسے صالح انسان، شاہد انسان اور صادق انسان کے درجات۔

یہ کہنا کہ اللہ کو اپنی زندگی میں ترجیح دینا ایک چھوٹی سی بات لگتی ہے، لیکن درحقیقت یہ بہت بڑی بات ہے، کیونکہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی اس کے تقاضوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر، میں دفتر سے آ کر بستر پر بیٹھا ہوں اور موبائل اٹھاتا ہوں۔ اب یہ میرے پاس وقت کی اہمیت ہے اور میرے سامنے حقیقت ہے کہ

اللہ تعالیٰ کتنی بڑی حقیقت ہے اور میری زندگی کی کتنی نعمتیں اس نے دی ہیں۔ اگر میرا فوکس اللہ ہے اور میری ترجیح یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزاروں تو پھر یہ دیکھنا ہے کہ میں موبائل پر کن چیزوں میں وقت گزارتا ہوں۔

اگر میں ریلز (Reels) میں ضائع ہو گیا اور بے مقصد ویڈیوز دیکھتا رہا تو یہ تو میرے اوپر ایک الگورِدم (Algorithm) کام کر رہا ہے۔ یہ نہیں ہو گا کہ میں اس سفر سے ایک متقی بن کر نکلوں، بلکہ یہ زوال کا سفر ہے۔ اس لمحے میں، میں نے اللہ کو ترجیح نہیں دی اور اپنی جبلتوں (instincts) کے پیچھے چل پڑا۔ اس چیز کے نتائج ہوں گے۔ یہاں پر غیر اخلاقی چیزوں میں وقت صرف کرنے کو جواز دینے کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ”تھوڑا ریلیکس کرنے دو“، لیکن یہ ترجیحات کا معاملہ ہے۔ یہی چیز پوری زندگی میں پھیلتی ہے۔ انسان کی جبلتیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ پھر ریلیکسیشن کے نام پر بڑی سے بڑی گم راہی اس کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ لہٰذا اللہ کی معیت (موجودگی) میں رہنے کا مطلب یہی ہے کہ لمحۂ موجود میں اپنے ہر انتخاب میں ہم اللہ کو اپنی زندگی میں ترجیح دیں، اپنے شعور میں اسے زندہ رکھیں۔

شاہد رضا

اسلام: امن و سلامتی کا دین

[جناب جاوید احمد غامدی کی تحریروں، آڈیوز اور ویڈیوز سے اخذ و استفادہ پر مبنی سوال و جواب]

سوال: کیا دین اسلام امن و سلامتی کا دین ہے؟

جواب: اسلام کا تعارف اگر ایک لفظ میں کرایا جائے تو اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ امن اور سلامتی کا دین ہے۔ اس میں دنیا کو جس چیز کی دعوت دی گئی ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ اللہ کے پیغمبر لوگوں کو امن اور سلامتی کی طرف بلاتے ہیں۔ اسلام کا فلسفہ و حکمت اور قانون و شریعت، دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ 'سُبُلُ السَّلَامِ'، یعنی سلامتی کے راستے ہیں (المائدہ ۵: ۱۶)۔ دنیا و آخرت، دونوں کے اعتبار سے اسلام کا فلسفہ و حکمت ہو یا اس کا قانون و شریعت، دونوں اصل میں انسان کی سلامتی کی ضمانت دیتے، اسے سلامتی کا راستہ دکھاتے اور سلامتی کی طرف بلاتے ہیں۔

چنانچہ اس دنیا کے بعد قرآن مجید جس ابدی دنیا کی خبر دیتا ہے، اس کے لیے بھی قرآن مجید 'دَارُ السَّلَام' ہی کی تعبیر استعمال کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات متعدد مقامات میں ارشاد فرمائی ہے کہ وہ دنیا جو بعد میں وجود میں آنے والی ہے، وہ ایک ابدی دنیا ہے اور جو تمھیں دنیاوی اعمال کے نتیجے میں ملنے والی ہے، وہ سلامتی کا گھر ہے:

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ. (الانعام ۶: ۱۲۷)

''اُن کے پروردگار کے ہاں اُن کے لیے سلامتی کا گھر ہے۔''

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ

''اور اللہ تمھیں سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے

مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ. اور اِس کے لیے جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق)، سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔'' (یونس ۱۰: ۲۵)

یعنی اللہ تمھیں سلامتی کے اس گھر کی دعوت دیتا اور اس کی طرف بلاتا ہے۔ ہم مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو شعار کے طور پر جس لفظ اور تعبیر کو اختیار کیا گیا ہے، وہ 'السلام علیکم' ہے، یعنی تم پر سلامتی ہو۔ اسلام نے یہ اپنے لیے ایک شعار مقرر کر دیا ہے۔ یہ چیز اسلامی معاشرت کا ایسا ناگزیر حصہ بن گئی ہے کہ گویا ہر مسلمان، ہر ملاقات کے موقع پر، ہر شخص سے بات کرتے ہوئے اس کو سلامتی کی دعا دیتا ہے۔ یہ سلامتی کی دعا دنیا کے اعتبار سے بھی ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ امن اور سلامتی اسلام کے لیے شعار، تعارف اور حقیقت بن کر رہ گئے ہیں۔ قرآن مجید نے دین کا جو فلسفہ و حکمت اور قانون و شریعت پیش کیا ہے، اس پر بھی نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب مواقع جو دنیا میں فساد پیدا کر سکتے ہیں، جس سے امن کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور جس سے دنیا محبت کے بجائے نفرت میں مبتلا ہو سکتی ہے، وہ ان کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کا ایک ایک قدم اسی راہ میں اٹھایا گیا ہے۔

چنانچہ دنیا میں انسان نے مفادات سے اوپر اٹھ کر جب بھی کبھی اس کائنات کے معاملات کو حل کرنا چاہا تو اس کے راستے میں بڑی رکاوٹ رنگ، نسل اور قوموں کا تفاوت آ گیا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن مجید نے جو فلسفہ دیا، اس کی بنیاد ہی یہ تھی کہ انسان ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں (الاعراف ۷: ۱۸۹)۔ اس طرح گویا عالمی اخوت کی بنیاد رکھ دی گئی، یعنی اس دنیا میں کوئی انسان رنگ و نسل کے اعتبار سے یا سادہ لفظوں میں، اپنی خلقت کے اعتبار سے کسی پر کوئی فضیلت اور برتری نہیں رکھتا۔ چنانچہ یہی وہ چیز ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں واضح کیا اور وہ لافانی الفاظ آپ کی زبان مبارک سے نکلے جس میں آپ نے یہ فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کسی نوعیت کی کوئی فضیلت نہیں ہے:

یَا أَیُّھَا النَّاسُ، أَلَا إِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاکُمْ وَاحِدٌ أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَی أَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَی عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَی أَسْوَدَ وَلَا أَسْوَدَ عَلَی أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَی. (احمد، رقم ۲۳۴۸۹)

''لوگو، تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ بھی ایک ہے۔ آگاہ ہو جاؤ، کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سرخ رنگ والے کو کالے رنگ والے پر اور کسی سیاہ رنگ والے کو سرخ رنگ والے پر کوئی فضیلت و برتری حاصل نہیں،

مگر تقویٰ کے ساتھ۔''

گویا انسانوں کے درمیان تصادم کو اپنی اصل اور بنیاد ہی سے ختم کر دیا۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب کسی مذہب یا نقطۂ نظر کو اختیار کرتا ہے تو اس میں بھی اس کے کچھ تعلقات و روابط وجود میں آتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کے لیے بھی 'اخوت' (بھائی چارہ) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ. (الحجرات ۴۹: ۱۰) ''ایمان والے تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

یعنی مسلمان آپس میں دینی اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. (الحجرات ۴۹: ۱۳) ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔''

اللہ کے نزدیک انسان کو فضیلت اور برتری کسی قبیلے، قوم، رنگ اور نسل کی بنیاد پر حاصل نہیں ہوتی، بلکہ تقویٰ، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے تعلق اور اس کے اخلاقی وجود کے تزکیے کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا تصادم کی گویا بنیاد ہی منہدم کر کے رکھ دی ہے۔ انسان جن بنیادوں پر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے، تفوق و برتری کا اظہار کرتے اور دنیا کو فساد کی آماج گاہ بناتے تھے، فلسفے کی سطح پر اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اس سے آگے بڑھ کر جب ہم شریعت کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدم قدم پر امن و سلامتی اور محبت کا یہی پیغام ہے، جو اس کی روح میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ دین کی دعوت کو دیکھیں تو دنیا میں جب کوئی مذہب اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھتا اور دوسروں پر اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہے تو بالعموم اس میں تحکم، دھونس اور دوسروں پر اپنا نقطۂ نظر مسلط کرنے کا جذبہ شامل ہو جاتا ہے، لیکن جب قرآن مجید نے دعوت کا طریق کار بتایا تو یہ فرمایا کہ:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ. (النحل ۱۶: ۱۲۵) ''تم، (اے پیغمبر)، اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیتے رہو حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے ساتھ، اور اِن کے ساتھ اُس طریقے سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے۔''

یعنی اللہ کی راہ کی طرف بلاؤ، لیکن حکمت کے ساتھ، دانائی کے ساتھ، اچھی نصیحت کے اسلوب میں اور اگر

کسی موقع پر کوئی ایسی چیز پیش آجائے جو تمھارے لیے بحث و مباحثے کا موضوع بن رہی ہو تو اچھے طریقے سے بحث و مباحثہ کرو۔ پھر بطور اصول یہ کہا کہ اس دنیا میں بات چیت اور گفتگو کا جو طریقہ اختیار کرنا ہے، وہ احسن طریقہ ہونا چاہیے، یعنی دوسرا آدمی اعتراض کرے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے اپنے حدود سے تجاوز کرے، تب بھی اس کی برائی کا جواب اچھے اسلوب میں دیا جانا چاہیے تاکہ امن اور محبت کی فضا قائم رہے۔ یہی فضا ہے جس میں درست طریقے سے دوسروں تک دین بھی پہنچایا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ جب تم محبت اور حکمت کے ساتھ اپنی بات کہو گے، رد عمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر جواب دو گے، دوسرے کی برائی کے مقابلے میں اچھائی کا رویہ اختیار کرو گے، اپنے آپ کو اشتعال سے بچاؤ گے اور شیطان کی دراندازی کے موقع پر اللہ کی پناہ چاہو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس شخص اور تمھارے درمیان دشمنی ہے، وہاں بھی تم دیکھو گے کہ بڑی خوبی کے ساتھ دوستی کے جذبات وجود پذیر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ دین کی دعوت جو اپنے اندر ایک جذباتی پہلو بھی رکھتی ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسروں کو بتانا چاہتا ہے، اس میں بھی قرآن مجید نے امن اور سلامتی کا طریقہ اختیار کیا۔ جو رد عمل انسان کو پیش آتا ہے، اس میں بھی جس چیز کی تعلیم دی، وہ تعلیم قرآن مجید اپنی مخصوص اصطلاح 'صبر' میں ادا کرتا ہے اور یہ فرمایا کہ اگر کسی موقع پر دوسرا شخص تم کو اشتعال میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے یا تمھارے خلاف کسی زیادتی کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

انسانی جان کی قدر و قیمت کے بارے میں بھی جو بات قرآن مجید نے کہی، وہ دنیا کے سارے الہامی لٹریچر میں تو کیا دنیا کے سارے قانونی لٹریچر میں بھی اپنے اسلوب کے اعتبار سے انتہائی نادر اور انتہائی بے مثل بات ہے۔ قرآن مجید نے وہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہوا اور اس نے پہلے قتل کا ارتکاب کیا۔ چنانچہ یہ واقعہ سیدنا آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان پیش آیا۔ تبصرہ کرتے ہوئے قرآن مجید نے کہا کہ یہی واقعہ تھا جس کے نتیجے میں ہم نے اپنی شریعت میں یہ بات ثبت کر دی کہ:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا. (المائدہ ۵: ۳۲)

''جس نے کسی ایک انسان کو قتل کیا، اِس کے بغیر کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک انسان کو زندگی بخشی، اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔''

جس شخص نے کسی کی جان لے لی اور اس کے بغیر جان لے لی کہ اس نے کسی کی جان لی تھی یا زمین میں فساد برپا کیا تھا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو ختم کر دیا۔ یہاں یہ 'فساد' کا لفظ بھی قابل غور ہے، یعنی بدامنی، محبت کا انقطاع اور آپس کی نفرت۔ اس کو قرآن مجید انسانی جان کے مقابلے میں قیمتی چیز قرار دے رہا ہے۔ یہ ختم ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر ہر چیز ختم ہو کر رہ جائے گی۔ بدامنی اور فساد کسی حال میں بھی گوارا نہیں کیے جا سکتے۔ امن ہر حال میں مطلوب ہے اور اسی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ یہ فرمایا ہے کہ اگر اس نے کسی کی جان نہیں لی ہے اور اس کو قتل کر دیا گیا یا اس کی جان لے لی گئی تو گویا اب پوری انسانیت کی جان لے لی گئی۔ اور یہ فرمایا کہ کسی ایک انسان کی زندگی کا سامان کر دیا گیا تو گویا پوری انسانیت کی زندگی کا سامان کر دیا گیا، یعنی قرآن مجید کے نزدیک انسانی جان کی یہ قدر و قیمت ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہاں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ جس نے کسی مسلمان کو قتل کیا، بلکہ یہ الفاظ ہیں کہ 'مَنْ قَتَلَ نَفْسًا'، یعنی کسی انسانی جان کو قتل کر دیا۔ انسانی جان کی یہی اہمیت ہے جس کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری خطبے میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ فرمائی کہ لوگو، تمھاری عزت، تمھاری جان اور تمھارا مال ایسی ہی حرمت رکھتے ہیں، جیسی حرمت یہ بیت اللہ، یہ شہر مکہ اور یہ ذوالحج کے ایام رکھتے ہیں، جن میں تم حج کرنے کے لیے آتے ہو۔ گویا مذہبی تقدس کی جتنی چیزیں آخری درجے میں ہو سکتی تھیں، ان کی مثال دے کر یہ واضح کر دیا کہ جو حرمت و تقدس ان کو حاصل ہے، جیسا احترام ان کا ہونا چاہیے، جس طرح ان کے معاملے میں آدمی کو محتاط ہونا چاہیے، اسی طرح انسانی جان کے بارے میں بھی محتاط رہنا چاہیے۔

مسلمانوں کے باہمی معاملات میں یہ اصول قائم کیا کہ ان کے ظاہر پر معاملہ کیا جائے گا، یعنی انسان جب دوسروں کی نیتوں کے پیچھے بھاگتا ہے، ان کے بارے میں ظنون و اوہام قائم کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ ان کے اندر اتر کر ان کے عقیدے اور نظریے کا فیصلہ کرے تو اس کو اسلام نے ممنوع قرار دے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہترین مثال قائم کی، جب آپ کو یہ بتایا گیا کہ ایک شخص نے میدان جنگ میں اس کے باوجود کہ اس نے اس بات کا اقرار کر لیا تھا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو معبود نہیں مانتا تو اس کو قتل کر دیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے یہ اقدام کیوں کیا؟ تو انھوں نے کہا کہ میں نے جب یہ دیکھا کہ یہ محض زبان سے اقرار کر رہا ہے اور جیسے ہی میں تلوار پیچھے ہٹاتا ہوں، وہ فوراً اپنے اس اقرار سے انحراف کرتا ہے تو میں نے اس کو قتل کر دیا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کے دل کو پھاڑ کر دیکھ لیا تھا؟ کیا تم نے اس کے سینے کو چیر کر دیکھ لیا تھا؟ تم کو کیا حق تھا کہ جب اس نے اقرار کیا تو

اس کے بعد اس کے اوپر کسی بھی نوعیت کی تعدی یا زیادتی کرتے؟ وہ صحابی کہتے ہیں کہ مجھے یہ خیال ہوا کہ اے کاش! میں زمین میں دفن ہو گیا ہوتا اور مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ بات سننے کے لیے اس زمین پر نہ رہنا پڑتا (مسلم، رقم ۲۷۷)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واضح فرمادیا کہ ایک انسان ایک حقیقت کو مان رہا ہے، اس کا اقرار کر رہا ہے تو تم کو کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے دل میں اتر کر دیکھو، اس کی نیت پر حملہ کرو، اس کے محرکات کا جائزہ لو اور یہ جاننے کی کوشش کرو کہ یہ فی الواقع درست کہہ رہا ہے یا غلط۔ قرآن مجید میں بھی یہی تعلیم ہمارے سامنے آتی ہے، یعنی وہ لوگ جن کو اسلامی اصطلاح میں 'منافقین' کہا جاتا ہے، ان پر تبصرہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار بتایا گیا کہ ان کے جتنے معاملات ہیں، ان کی اصلاح تو کی جائے گی، لیکن ان کو اسلامی معاشرے سے کاٹا نہیں جا سکتا، ان کے ساتھ مشورے کا تعلق ختم نہیں کیا جا سکتا اور ان کے معاملے میں عفو و درگذر ہی کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کی یہ خصوصیت بیان کی گئی کہ اسی وجہ سے لوگ آپ کے گرد جمع ہوئے ہیں کہ آپ نرم خو اور محبت سے بات کرنے والے ہیں، آپ کا پیغام محبت کا پیغام ہے، آپ کی شخصیت محبت کی شخصیت ہے، آپ مثبت اقدار کے حامل ہیں جو محبت سے فروغ پاتی ہیں اور آپ دنیا میں بدامنی پھیلانے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانْفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ.

(آل عمران ۳:۱۵۹)

''سو یہ اللہ کی عنایت ہے کہ تم اِن کے لیے بڑے نرم خو واقع ہوئے ہو، (اے پیغمبر)۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ اِس لیے اِن سے درگذر کرو، اِن کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں اِن سے مشورہ لیتے رہو۔ پھر جب فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسا کرو، اِس لیے کہ اللہ کو وہی لوگ پسند ہیں جو اُس پر بھروسا کرنے والے ہوں۔''

یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر بڑا کرم ہے کہ اس نے آپ کو نرم خو بنایا ہے۔ اگر آپ درشت خو ہوتے، سخت کلامی سے کام لیتے اور دوسرے لوگوں پر شدت برتتے تو یہ لوگ آپ کے گرد جمع نہ ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں

کو خاص طور پر یہ بشارت دی کہ اللہ کا تم پر کرم ہوا ہے کہ اس نے تمھارے دلوں میں محبت پیدا کر دی ہے (آل عمران ۳: ۱۰۳)۔ اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے بھی اور قانون و شریعت کے اعتبار سے بھی قدم قدم پر دین کی دعوت یہی ہے کہ لوگوں کو امن اور سلامتی کا پیغام دیا جائے اور ان محرکات کا خاتمہ کیا جائے جو دنیا میں بدامنی کا باعث بنتے ہیں۔ 'فساد فی الارض' قرآن مجید کی خاص اصطلاح ہے اور ایک مقام پر اس کی وضاحت کی ہے کہ جب لوگوں کے جان و مال اور امن و امان کے لیے خطرہ پیدا کر دیا جائے، جب محبت اور سلامتی کی فضا ختم کر دی جائے، جب لوگوں کو دنیا میں اعتماد سے جینے کے مواقع ختم کر دیے جائیں تو یہ فساد فی الارض ہے۔ فساد سے بڑھ کر قابل مذمت کوئی اور چیز نہیں ہے۔ قرآن مجید نے حدود و تعزیرات کے ضمن میں سب سے سخت سزا اسی کی مقرر کی ہے۔ قرآن مجید میں تین چار سزائیں ایسی ہیں جن کی سزا خود قرآن مجید نے مقرر کی ہے، ان میں سے سب سے زیادہ سخت سزا اسی کی ہے۔ اس حوالے سے جو اس نے الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ یہ ہیں کہ:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَاَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ. (المائدہ ۵: ۳۳)

”جو اللہ اور اُس کے رسول سے لڑیں گے اور اِس طرح زمین میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے، اُن کی سزا پھر یہی ہے کہ عبرت ناک طریقے سے قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں یا اُنھیں علاقہ بدر کر دیا جائے۔“

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتے ہیں اور اس طرح سرکشی اختیار کرتے ہیں کہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، امن کے خاتمے کے پیامبر بن جاتے ہیں، سارے نظم کو درہم برہم کر دینا چاہتے ہیں، قانون کو چیلنج کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو عبرت ناک طریقے سے قتل کر دیا جائے۔

یہ قرآن مجید انسانی جان کی قدر و قیمت بیان کرتا ہے۔ وہ فساد کو ایک بڑا جرم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے جب جہاد و قتال کے احکام دیے تو اس میں بھی یہ بات بڑی وضاحت سے بیان کر دی کہ یہ تلوار اٹھانے کا حق اس لیے نہیں دیا جا رہا کہ تم اپنا عقیدہ ان پر ٹھونس دو اور جس پر چاہے، چڑھ دوڑو، یہ حق اس لیے دیا جا رہا کہ تمھارے خلاف ظلم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے یہ قانون اس لیے بنایا ہے کہ کلیسے،

گرجے، خانقاہیں، راہبوں کے بیٹھنے کی جگہیں، یہودیوں کے کنیسے اور مسلمانوں کی مسجدیں برباد نہ کر دی جائیں، یعنی صورت حال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی مسجدوں کی حفاظت کی بات کی جا رہی ہے، بلکہ قرآن مجید نے تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کے نام گنوائے اور یہ بتایا کہ اگر ہم یہ اجازت نہ دیتے تو لوگ ان کو منہدم کر دیتے اور یہ سب وہ جگہیں ہیں جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔

اس سے زیادہ رواداری، محبت اور دوسروں کی عبادت گاہوں کے احترام کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو جہاد اور قتال کا بھی حکم دیتے وقت کہا جا رہا ہے کہ اللہ کا نام جن جگہوں پر لیا جا رہا ہے اور جو لوگوں نے اللہ کی عبادت کے لیے گھر بنا رکھے ہیں، قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمانوں کے ہیں یا کسی اور گروہ یا فرقے کے ہیں، ان کا احترام تم کو کرنا ہے اور ان کی حفاظت کے لیے جان لڑا دینی ہے۔ یہ اسلام میں جہاد اور قتال میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ امن و محبت اور لوگوں کے درمیان مثبت اقدار کے فروغ کے لیے اگر پیغمبروں کی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سارا کا سارا نقطۂ نظر عدم تشدد (non-violence) پر مبنی ہے۔ وہ بد سے بدترین حالات کا مقابلہ کرتے ہیں، لیکن تلوار اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دیکھیں کہ ۱۳ سال تک مکے میں ہر طرح کا ظلم سہ لیا گیا اور ہر طرح کے تشدد کا مقابلہ کر لیا گیا اور ہر وہ برائی جس کا تصور کیا جا سکتا ہے، وہ آنکھوں کے سامنے دیکھ لی گئی، یہاں تک کہ بیت اللہ کو اس حال میں دیکھا گیا کہ اس میں بت رکھ دیے گئے تھے، اس کے باوجود کسی اقدام کی اجازت نہیں دی گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے اطمینان کے لیے اگر کسی موقع پر کچھ کہا بھی تو یہ کہا کہ یہ جو تم پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے، میں اس کے مقابلے میں تم کو جنت کی بشارت دیتا ہوں۔ گویا دین نے امن اور سلامتی کو اپنی بنیاد بنا کر اپنی دعوت پیش کی۔ جب ایک منظم ریاست قائم ہوئی، تب بھی اس نے تلوار اٹھائی تو زیادتی اور ظلم و عدوان کے خاتمے، لوگوں کو تحفظ دینے اور امن قائم کرنے کے لیے تلوار اٹھائی۔ یہ بتایا کہ یہ امن اور سلامتی ہے، جس کے لیے ایک مسلمان کو جان دینے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔[۱]

۱-https://ghamidi.com/videos/islam-640

محمد بلال

حیات امین احسن

(۱۶)

تعلق باللہ

امین احسن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت مضبوط تعلق تھا۔ دنیاداری ان کی کبھی بھی ترجیح اول نہ تھی۔ ملک عبدالرشید صاحب عراقی کے نام ۱۳؍ مئی ۱۹۸۰ء کو لاہور سے ایک مکتوب میں امین احسن لکھتے ہیں:

"میری کوشش اور تمنا تو صرف یہ ہے کہ کسی طرح 'والناس' تک پہنچ جاؤں۔ اس کے بعد کا کوئی پروگرام سامنے نہیں ہے۔ اب 'فاذا فرغت فانصب والی ربك فارغب' پر عمل کرنے کا جی چاہتا ہے۔ اوراق بہت سیاہ کیے۔ اب لکھنے کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ لوگوں سے داد حاصل کرنے کی بھی کوئی خواہش نہیں ہے۔"

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۱۷)

انکار خدا

حیات امین احسن میں ایک مقام ایسا بھی آیا کہ جب ان کے دل میں مذہبی ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کے لیے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ منکرین خدا کا موقف صحیح ثابت ہو جائے۔ صاف گو امین احسن لکھتے ہیں:

"جب اول اول مجھے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ خدا ہے اور ضرور ہے، نیز یہ کہ انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس سے مفر نہیں ہے، تو اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ اس ماننے سے بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی میں ان ذمہ داریوں کے متعلق سوچتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ

اس کا بوجھ میری کمر توڑ دے گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کچھ فلسفی ایسے بھی ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی چیزوں کا بھی مطالعہ کروں۔ اور صاف طور پر عرض کیے دیتا ہوں کہ بغیر کسی تعصب کے میں نے ان چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر چھپی ہوئی خواہش بھی موجود تھی کہ اگر یہ فلسفی یہ ثابت کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا اس لیے کہ اس طرح بہت بڑے بوجھ سے نجات مل جائے گی۔ یہ ایک مخفی راز ہے جو میں آپ پر ظاہر کر رہا ہوں۔ ویسے الحمد للہ! مجھ پر الحاد کا کوئی دور نہیں گزرا ہے لیکن مجھ پر ایک ایسا دور ضرور گزرا ہے کہ جب میرے اندر یہ خواہش تھی کہ اگر یہ فلسفی حضرات خدا کا انکار ثابت کر دیں اور مجھے مطمئن کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو بہر حال ایک اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے گا اور سر سے ایک بھاری بوجھ اتر جائے گا۔ اس خواہش کے تحت میں نے متکلمین کی، دہریوں کی، منکرین کی، ڈارون کی، مارکس کی، فرائڈ کی، غرض کہ ان سب لوگوں کی کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھیں اور بغیر کسی تعصب کے پڑھیں، لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں پڑھنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ سب خرافات ہیں اور بدیہی حقیقت سے انکار کی خواہش ان سے یہ کام کرا رہی ہے، باقی رہ گیا یہ کہ خدا کے انکار کے لیے ان لوگوں کے پاس واقعی کوئی دلیل ہے تو اس کی سرے سے گنجائش ہی نہیں! جو بات یہ پیش کرتے ہیں اس سے ہزار گنا مضبوط اور بدیہی بات وہ ہے جو قرآن حکیم پیش کرتا ہے کہ ایک خدا کو، ایک رب کو، ایک رحمان کو، ایک رحیم کو، ایک علیم کو، ایک خبیر کو، ایک سمیع کو اور ایک بصیر کو مانو! اس بات پر عقل بھی گواہی دیتی ہے اور فطرت بھی گواہی دیتی ہے۔ ظاہر بھی گواہی دیتا ہے اور باطن بھی گواہی دیتا ہے۔ آفاق بھی گواہی دیتے ہیں اور انفس بھی گواہی دیتے ہیں۔ غرض کہ ایک ایک چیز گواہی دیتی ہے۔“ (مقالات اصلاحی ۲/ ۲۸۷)

خودداری اور بے نیازی

خودداری اور بے نیازی امین احسن کی شخصیت کے اہم اوصاف تھے۔ اس ضمن میں ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

”کشادہ دست تھے، پس انداز کرنے کی کبھی عادت نہیں رہی، جو پاس ہوتا بے دریغ خرچ کر ڈالتے۔ سائل کو اپنی حیثیت سے زیادہ دیتے تھے۔ حرص و ہوس کا کوئی شائبہ بھی ان میں نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جن اعلیٰ و برتر مقاصد کے لیے پیدا کیا تھا انھی میں شب و روز منہمک رہتے۔ گھر گرہستی کے کاموں سے کوئی

سروکار نہ رکھتے۔ ان کی ضرورتوں کا سامان ان کے عزیز اور احباب مہیا کرتے تھے جن سے کہا کرتے کہ 'أنتم أعلم بأمور دنیاکم'۔[۱۰]" (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۱۴-۱۵)

ابوسفیان اصلاحی لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ مولانا نے گفتگو کے درمیان بتایا کہ اسی جگہ صدر مرحوم ضیاء الحق تشریف لائے تھے اور انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ آپ ہفتہ میں کسی ایک دن ٹی وی پر درس قرآن دیا کریں۔ میں نے جواب دیا کہ میرے درس کے بعد رقص کا سلسلہ شروع ہو، میں ایسا درس دینے سے قاصر ہوں۔ ضیاء الحق صاحب کے مطالعہ میں 'تدبر قرآن''، مستقل رہا کرتی تھی۔" (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۸۸)

مدرس قرآن قاضی محمد کفایت اللہ لکھتے ہیں:

"...ان دنوں مرحوم صدر ایوب خان نے جب مرحومہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں فتح حاصل کرلی تو امام اصلاحی سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ امام اصلاحی نے انھیں ملاقات کا شرف بخشا۔ مولانا کے حوالے سے یہ ملاقات ماضی کے اکابرینِ امت کی اعلیٰ و شاندار روایات کا احیا تھی۔ امام اصلاحی نے اپنے موقر ماہنامہ ''میثاق''، میں تذکرہ و تبصرہ کے عنوان کے تحت جو لکھا تھا اسے پڑھنے سے مرحوم صدر کو یہ خیال ہوا کہ اصلاحی صاحب نے ان کی بالواسطہ تائید فرمائی ہے، حالانکہ مولانا کے ہاں مسئلہ یہ تھا کہ ''دین کیا ہے اور کیا نہیں''، اسے واضح کیا جائے۔

صدر مرحوم نے یہ چاہا کہ وہ اس نصرت و تائید کے لیے امام اصلاحی کے ہاں اپنی ممنونیت کا اظہار کرے۔ ملاقات کے دوران میں مرحوم صدر نے یہ عندیہ بھی دیا کہ وہ آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ صدر ایوب کا کیا طنطنہ تھا اور ان کے ایک اشارۂ ابرو سے کس طرح افراد و جماعات کے بناؤ بگاڑ کے نہ صرف فیصلے ہوتے تھے بلکہ وہ فیصلے واقعاتی صورت میں ڈھلتے ہوئے نظر آتے تھے اور مرحوم صدر کے ہاں مخدومیت پانے کے لیے اس وقت کے بڑے بڑے اہل سیاست اور اصحابِ جبہ و دستار کس کس طرح حیلوں اور بہانوں کی تلاش میں مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ لیکن امام اصلاحی نے مالی عدم سازگاریوں کے باوجود جس شانِ استغنا سے مرحوم صدر کی پیش کش کو ٹھکرا دیا، وہ آپ جیسے روشن ضمیر اور صاحب دل ہی کا مقام تھا۔ آپ کے اس پیش کش کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ آپ نے فرمایا: جناب صدر،

۱۰۔ ''تم دنیا کے امور زیادہ بہتر جانتے ہو۔''

میں نے اپنے ایمانی و اخلاقی فریضے کو انجام دیا ہے۔ میں نے جس چیز کو حق سمجھا ہے اس کا برملا اظہار کر دیا ہے۔ میں نے اپنی رائے کے اظہار کے دوران میں اس امر کی قطعاً پروا نہیں کی کہ میری اس رائے کے اظہار سے کس کس کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ کون کون اس سے کیا کیا فائدہ اٹھائے گا یا کس کس کو اس سے کون کون سا نقصان ہو گا۔ میں نے تو ایک ایمانی فریضہ سمجھتے ہوئے جو کچھ صحیح سمجھا اس کا اظہار کر دیا۔ اس سے آپ کو فائدہ پہنچا مجھے معلوم نہیں۔ یہ ایک فریضہ تھا، جو ادا ہو گیا۔ اس کے بدلے میں آپ سے کوئی خدمت چاہنا یا اسے قبول کرنا، یہ میرے لیے قطعاً روا نہیں ہے۔ میرے نزدیک حق کا اظہار، دین کا تقاضا ہے اور حق کا کتمان، ایمانی جرم۔ میں نے جو کچھ کیا وہ آپ سے کوئی اجر پانے کے لیے نہیں کیا بلکہ میں نے یہ کام اپنے مالک و مولا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا ہے اور بس۔ البتہ اگر آپ میری کوئی خدمت کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ آپ پاکستان میں عدل و قسط کی اقدار کو رواج دیں۔ اپنے اہالی و موالی اور اپنے ماتحت اداروں کو عدل و قسط کا پابند بنائیں۔ قانون و عدل کی حکمرانی کو ایک محسوس حقیقت بنائیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے طرز حکمرانی کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر اپنائیں۔ اپنے ماتحت تمام انتظامی اداروں کو ان نمونوں کے مطابق ڈھالنے کی جد و جہد کو تیز سے تیز تر کر دیں۔ اس کے نتیجے میں مجھے گمان ہی نہیں، یقینِ واثق ہے کہ آپ کا نام بھی پاکستان کی تاریخ میں تا ابد زندہ رہے گا اور آپ کا یہ ایسا صدقۂ جاریہ ہو گا جو رہتی دنیا تک پاکستانیوں کے لیے مینار نور کا کام دیتا رہے گا۔ آنے والے پاکستانی حکمران اس مینار نور سے کسبِ ضیا کر کے ملک و ملت کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت انجام دیتے رہیں گے۔

مجھے یہ واقعہ ایک نہایت ثقہ بزرگ نے سنایا تھا اور انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ کی اس ملاقات کے بعد صدر ایوب کئی دنوں تک ارکان کابینہ اور عمائدین سلطنت کے سامنے فخر کے ساتھ اس ملاقات کا ذکر کرتے رہے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے ارد گرد ایسے علماے وقت اور صلحاے سیاست کی کمی نہیں جو ہمارے حق میں بولنے سے بہت پہلے اپنے ہر قول کا تول لگوانے کی سعیِ بلیغ میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ہمارے اس علامہ صاحب کو دیکھو کہ جنھوں نے اپنے رسالے میں ہمارے حق میں علم و حکمت کے دریا بہا دیے اور جب ہم نے انھیں اپنی جانب سے کسی خدمت کی کچھ پیش کش کی تو آپ نے شانِ استغنا کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری اس پیش کش کی جانب نگاہِ غلط بھی نہیں ڈالی۔ حالانکہ ہمیں علم ہے کہ ان کا جواں سال بیٹا انھی دنوں اندوہناک حادثے میں وفات پا چکا ہے اور اس وفات کی وجہ سے آپ کے ناتواں کندھوں پر گوناگوں ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا ہے۔" (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۵۱-۵۲)

مہمان نوازی

امین احسن کی مہمان نوازی صرف کھلانے پلانے تک محدود نہ تھی، بلکہ اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔اس ضمن میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

”طبیعت میں بڑی تواضع اور بڑی شفقت تھی۔ جن دنوں رحمٰن آباد میں تھے، میں ایک مرتبہ ملنے کے لیے گیا تو رات وہیں ٹھیرا۔ فجر سے کچھ پہلے میں نے محسوس کیا کہ ذرا دور کوئی ہاتھ کے نل سے پانی کی بالٹی بھرتا اور پھر اسے انڈیل دیتا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ امین احسن ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میری چارپائی کے پاس آئے اور فرمایا: میں نے تازہ پانی نکال دیا ہے، اٹھیے اور وضو کر لیجیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں اور کیا کروں۔“(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص۲۶)

جناب سلیم کیانی اس بارے میں بتاتے ہیں:

”میں سات برس تک ان سے مستفیض ہوا۔ اس دوران میں میں نے مولانا اصلاحی کو انتہائی حساس، بامروت، ہمدرد، شفیق، بے تکلف لیکن دلیل کو ماننے والا، گرم جوش محبت کرنے والا پایا۔ جو بھی ان سے ملنے آتا یہ محسوس کرتا کہ مولانا اس کو اہمیت دے رہے ہیں اور پوری توجہ اس پر صرف کر رہے ہیں۔ نہ تو وہ لوگوں کو گُھرکتے [ڈانٹنا۔ دھتکارنا۔ تنبیہ کے لیے سخت آواز سے بولنا] اور نہ ہی انھیں بے وقعت سمجھتے۔“

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص۲۷)

محترم ابوسفیان اصلاحی نے لکھا:

”میں لاہور آنے کی جب انھیں اطلاع دیتا تو وہ کسی نہ کسی کو اسٹیشن بھیج کر اپنی کار سے مجھے منگواتے اور فرماتے کہ یہ تمھارا کمرا ہے اور یہ تمھارے لیے کار ہے۔ تم جہاں چاہو آجا سکتے ہو۔ اکثر ہوا کہ کئی کئی روز مولانا کی خدمت میں قیام رہا... ایک مرتبہ لاہور آنے کی اطلاع میں نے مولانا کو بھی دی اور ساتھ ہی ساتھ مدیر نقوش محمد طفیل صاحب کو بھی۔ جاوید صاحب مجھے اپنے گھر لے کر چلے گئے۔ شام کو جب جاوید صاحب کے ایک عزیز کے ساتھ مولانا سے ملنے گیا تو ان سے فرمایا: ”آپ میرے مہمان کو اغوا کر کے لے گئے“ اس جملہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر مہمان نواز تھے اور چھوٹوں سے کتنا مشفقانہ برتاؤ کیا کرتے تھے۔“

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص۸۷-۸۸)

ایک خاتون کو شک پڑ گیا کہ ان پر جادو کیا گیا ہے تو امین احسن نے انھیں ایک نصیحت کی۔ غور کریں، اس

خاتون کو گھر میں برکت کے لیے نماز اور تعوذ کے بعد کس بات کی نصیحت کر رہے ہیں:

''ان کو میری طرف سے پیغام دیجیے کہ جادو وغیرہ کا وہم اپنے ذہن سے نکال دیں۔ اس قسم کے اوہام جاہلوں کے اندر ہوتے ہیں۔ ان جیسی تعلیم یافتہ خاتون کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کسی جاہلانہ وہم میں مبتلا ہوں۔ اگر ان کو میرے علم پر اطمینان ہے تو میں ان کو یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ محض ایک شیطانی وسوسہ ہے جس میں مبتلا ہونا ایمان کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی شیطانی عمل کسی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اور شیطانی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے نماز کی پابندی اور تعوذ کافی ہے۔

دوسری بات ان کو یہ پہنچائیے کہ دروازے پر جو مہمان بھی آئے، جس وقت بھی آئے، خوش دلی کے ساتھ اس کا خیر مقدم اور حسب توفیق اس کی تواضع ایک اسلامی ذمہ داری ہے، اور اس ذمہ داری کو حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرنا اصلاً گھر کی مالکہ کا کام ہے۔ اگر اس میں ادنیٰ کوتاہی بھی ہو تو اس سے میاں بیوی بلکہ پورے خاندان کی عزت خاک میں مل جاتی ہے اور ساتھ ہی گھر کی برکت بھی اٹھ جاتی ہے۔ مہمانوں کے درمیان یہ تفریق بالکل ناجائز ہے کہ وہ بیوی کا مہمان ہے یا شوہر کا۔ ہر مہمان پورے گھر کا مہمان ہوتا ہے اور خاطر مدارت کی ذمہ داری، جیسا کہ میں نے عرض کیا، گھر کی مالکہ پر ہوتی ہے۔''

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۲۷)

پڑھنے اور لکھنے کا منفرد ذوق

پڑھنے لکھنے کا ذوق تو ہر عالم فاضل شخصیت کے ہاں ہوتا ہی ہے، مگر امین احسن اس معاملے میں بھی منفرد مقام رکھتے تھے۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر اس وصف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا اصلاحی کا کتب خانہ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ اب جو مولانا سے ملاقات ہوئی اور وہ بہت شفقت اور محبت سے پیش آئے تو ہمت کر کے اس اشتیاق کا اظہار کر دیا۔ مولانا نے جواب میں بتایا: میرے پاس تو کوئی کتب خانہ نہیں۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ مولانا فرمانے لگے: میرے پاس (ایک مرتبہ پہلے) ایک صاحب آئے تھے انھیں گمان تھا کہ اصلاحی کے پاس تو بہت بڑا کتب خانہ ہوگا۔ میں نے انھیں بتایا کہ دو الماریاں، جن میں چند کتابیں ہیں اور بس۔ دراصل ہم نے اپنے استاد سے یہ بات سیکھی کہ ''کیا پڑھنا ہے''۔ آپ سارا رطب و یابس پڑھنے کی بجائے منتخب چیزیں پڑھیں۔ سب کچھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ پھر ایک واقعہ سنایا کہ مجھے ایک صاحب ایک لائبریری میں لے گئے اور بتانے لگے کہ اس لائبریری میں بتیس ہزار (۳۲۰۰۰) کتابیں ہیں۔

میں نے ان سے کہا ان میں پڑھنے کی تو چند ایک ہی ہوں گی۔

میں نے عرض کیا، لیکن تفسیر لکھتے ہوئے تو آپ کو بہت سی کتب فراہم کرنا پڑی ہوں گی؟ اس کے جواب میں مولانا نے بتایا: تفسیریں اصل میں تین ہیں۔ باقی سب ان تفسیروں کی تفسیریں ہیں۔ (میں نے ان تفسیروں کے نام جاننا چاہے تو مولانا نے فرمایا: ''اسے چھوڑیں اس سے بحث چھڑ جائے گی'') اسی طرح حدیث کی بھی اصل میں دو یا تین کتابیں ہیں۔ آگے سب تشریح در تشریح ہے۔ میں نے تفسیر لکھتے وقت اصل چیزوں کو پڑھا، باقی کو چھوڑ دیا۔

میرا اگلا سوال ادب کے بحر ناپیدا کنار کی غواصی سے متعلق تھا، اس کے جواب میں مولانا نے بتایا کہ تفسیر لکھنے کے دوران میں جتنی مقدار میں عربی ادب سے واقفیت ضروری تھی وہ تو سارا پڑھا لیکن بعض جاہلی شعراء کا کلام جس کی تفسیر کے لیے ضرورت نہیں تھی چھوڑتا رہا۔ وہ اب پڑھا ہے۔ اب بعض شعراء کو (جن کے مولانا نے اس وقت نام بھی بتائے) مکمل پڑھا ہے لیکن تفسیر کا کام مکمل کر لینے کے بعد۔

... نماز کے بعد ہم مولانا سے کسی نصیحت کے خواہاں ہوئے۔ مولانا، انتخاب سے پڑھنے کی اہمیت پہلے واضح کر چکے تھے، اب انھوں نے انتخاب سے لکھنے کی ضرورت کو زور دیا اور اس میں بھی سند اپنے استاد سے لائے، فرمانے لگے: مولانا فراہی بہت زیادہ لکھنے کو دوسروں کا وقت ضائع کرنے سے تعبیر کرتے تھے اور کہا کرتے تھے: ''ہمیں کسی کا وقت ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' میں یہ کہتا ہوں ''یونہی کاغذ سیاہ کرنے کا کیا فائدہ...'' انسان کو بہت سوچ سمجھ کر اور انتخاب سے لکھنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ہمیشہ طالب علم کی زندگی گزارے۔ ہمیشہ طالب علم رہو، طالب علم رہنے سے ہی کچھ حاصل ہوتا ہے، سب سے اچھی حیثیت طالب علم کی ہے۔ مولانا فراہی اپنے کتب پر ''المعلم فراہی'' لکھتے تھے، میں نے اپنی کتب پر ہمیشہ ''المتعلم اصلاحی'' لکھا۔

طالب علم رہنے کی ضرورت پر مزید زور دیتے ہوئے فرمانے لگے: آج کل علم کم یاب ہو گیا ہے۔ لوگوں کی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔ سطحی سی معلومات ہیں۔ مختلف مسالک کے لوگ اپنے مسلک کے ایک دو نام ور علما کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں اور بس... فتاویٰ کی کتابیں چھپ گئی ہیں۔ انھی سے سارا دین سمجھ لیا جاتا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا، اخبارات انھی کو علامہ بنا دیتے ہیں... دین کی صحیح فہم براہ راست حاصل نہیں کرتے۔'' (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۲-۶۴)

ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

’’وہ مدرسۃ الاصلاح کے گل سر سبد تھے ہی، حق یہ ہے کہ پورے برصغیر میں اس پایہ کے عالم، خطیب اور مصنف کم ہی لوگ ہوں گے۔ان کی کتابوں کی تعداد بعض مصنفین کے مولفات ورسائل کی طرح چاہے سینکڑوں نہ ہو لیکن جن لوگوں کی کمیت کے بجائے کیفیت پر بھی نظر رہتی ہے وہ یہی کہیں گے :

بغاث الطير أكثر ها فراخا

و ام الصقر مقلاه نزور‘‘[11]

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۱۵)

متوازن، معقول اور معتدل

جناب عبدالحمید برایشق کا تعلق ترکی سے ہے۔انھوں نے اردو تفاسیر پر تحقیقی کام کیا ہے۔وہ ’’تدبر قرآن‘‘ کے ضمن میں امین احسن سے ملے۔اس ملاقات کی روداد بیان کرتے ہوئے انھوں نے ان کے کچھ شخصی اوصاف پر بھی لکھا:

’’جنوری ۱۹۹۴ء میں تفسیر پر گفتگو کرنے کے لیے مولانا سے ان کی قیام گاہ پر ملنے جاتا رہا۔اس وقت مولانا بہت مشکل سے سنتے تھے۔ لہٰذا میں نے سوالات لکھ کر کیے اور مولانا نے بڑی تفصیل سے ان کے جوابات دیے۔ یہ جوابات مدلل بھی تھے، معقول بھی اور معتدل بھی۔ بیک وقت یہ تین چیزیں برصغیر پاک وہند کے علما میں مشکل ہی سے جمع ہوتی ہیں۔ مولانا کے اس پہلو نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں ان کی کتابیں اپنے ساتھ ترکی لایا اور ان کو بڑے غور سے پڑھا۔ میں نے دیکھا کہ اعتدال ہی ان کا اصل مزاج اور سرمایہ ہے اور وہ اپنی بات نہایت مدلل طور پر پیش کرتے ہیں۔

میرے خیال میں عالم اسلام کے مسلمانوں کا عموماً اور برصغیر کے مسلمانوں کا خصوصاً ایک اہم مسئلہ فرقہ بندی ہے۔اپنے فرقہ کی خاطر لوگ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح بتادیتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک فرقہ یا جماعت کی بزرگ شخصیات اپنے فرقہ کے لیے بت بن جاتی ہیں اور اس فرقہ کے علما اور پڑھے لکھے اشخاص اپنا وقت ان کے فضائل لکھنے میں ضائع کردیتے ہیں۔ ہر جماعت دوسری جماعت کے ساتھ اس بارہ میں مقابلہ اور مسابقت کرتی ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ شان دار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل

۱۱۔ ’’چھوٹے پرندوں کی اولاد کثیر ہوتی ہے، جب کہ شاہین کی اولاد کم، اس لیے کثرتِ تعداد کو فضیلت نہ گردانو!‘‘

کسی طرح بھی صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جماعت کا وجود اور جماعت کے بزرگوں کا احترام ہونا ایک اچھی بات ہے، لیکن اس میں ایک توازن اور مدح کی ایک حد ہونی چاہیے۔ مولانا اصلاحی کے اندر میں نے اس توازن اور اعتدال کا مشاہدہ کیا۔ وہ کہیں کہیں اپنی علمی تحقیق کی روسے اپنے استاذ یا کسی قریبی دوست سے بھی اختلاف رائے کا اظہار کر دیتے۔ اگر برصغیر کے تمام علما میں یہ خصوصیت پیدا ہو جائے تو معاشرہ میں ان کا مرتبہ اور مقام بے حد اونچا ہو سکتا ہے۔'' (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۹۱)

حکومتی مناصب کے بارے میں رویہ

عام طور پر روایتی علما حکومتی مناصب حاصل کرنے کے لیے خود کوششیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، مگر امین احسن اس معاملے میں بھی سب سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ حکومتی مناصب چل کر ان کے پاس آتے تھے، مگر وہ انھیں ٹھکرا دیتے تھے۔

۱۹۵۶ء میں حکومت نے ملکی آئین کے تقاضے کے تحت ایک اسلامک لاء کمیشن قائم کیا۔ امین احسن کو بھی اس کا رکن بنایا گیا۔ دو سال گزر گئے، مگر کمیشن کام نہ کر سکا۔ بالآخر جنرل محمد ایوب خان کے مارشل لاء نے اسے ختم ہی کر دیا۔ اس تجربے سے امین احسن اس نتیجے پر پہنچے کہ حکومت اسلامی قانون کے نفاذ میں مخلص نہیں۔ ایسے ادارے قائم کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی کام ڈھنگ سے نہ ہو سکے اور مختلف سوچ رکھنے والے ارکان آپس میں چونچیں لڑاتے رہیں۔ یہ محض دفع الوقتی اور لوگوں کو خاموش کرانے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد امین احسن نے ایسی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

دور ایوب میں حکومت میں مخالف پارٹیوں نے مل کر مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لیے نامزد کیا۔ جماعت اسلامی نے اس نامزدگی کی حمایت کی اور اس کے حق میں لٹریچر تیار کیا۔ امین احسن نے اس نامزدگی کی سخت مخالفت کی اور جماعت کے موقف کے تار و پود بکھیر دیے۔ یہ مضامین ''میثاق'' میں شائع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ مضامین بالواسطہ طریقے سے ایوب خان کے حق میں جاتے تھے، اس لیے حکومت نے انھیں اپنے اہتمام میں شائع کر کے ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔ ایوب خان صدر منتخب ہو گئے۔ جب لاہور آئے تو گورنر ہاؤس میں امین احسن سے ملاقات کی۔ ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی تحریروں کا انھیں بڑا فائدہ ہوا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے پیش کش کی کہ مولانا، پبلک میں آئیں۔ حکومت ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے گی اور ان کی پسند کے میدان میں ان کو کسی اہم منصب پر فائز کرے گی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان دنوں امین احسن شدید

مالی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے، مگر اس کے باوجود انھوں نے صدر پاکستان کو یہ جواب دیا:

"مضامین میں نے آپ کی حمایت میں نہیں لکھے بلکہ عورت کی سربراہی کے بارے میں دینی موقف کی وضاحت کے لیے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ جو کام اس وقت کر رہا ہوں وہ میری زندگی کا مشن ہے۔ اس میں، میں کسی چیز کو رکاوٹ بننے نہیں دینا چاہتا۔ لہٰذا شکریہ کے ساتھ آپ کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت چاہتا ہوں۔"

جون ۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ ان دنوں امین احسن اپنی بیماری سے اٹھے تھے۔ ایک شخص ملنے آیا۔ امین احسن سے ملکی سیاست کے بارے میں پوچھا۔ امین احسن نے جواب دیا:

"میں نے چھ ماہ سے اخبار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اخبار کی سرخیاں اب دیکھنے لگا ہوں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ایک بڑے بحران کے دروازے پر کھڑے ہیں۔"

وہ شخص بولا:

"عوامی حکومت اس بحران کا مقابلہ کر رہی ہے۔"

پھر اس شخص نے اپنے اصل مقصد کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ شاید وہ امین احسن کے حالات سے واقف تھا۔ اس نے ان کے مصارف اور وسائل کے بارے میں پوچھا۔ امین احسن نے کہا:

"مہنگائی کا زمانہ ہے، مصارف کافی زیادہ ہوتے ہیں، لیکن خدا دیتا ہے، اسی پر بھروسا ہے۔"

"آپ جیسے لوگوں کی سرپرستی حکومت بھی کرتی ہے۔"

اس شخص نے امین احسن کو آسان آدمی سمجھا۔ امین احسن نے جواب دیا۔

"کرتی ہوگی، لیکن میں نے کبھی کسی حکومت کا ساتھ نہیں دیا۔ ہر حکومت پر تنقید کرتا ہوں۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ ایسے شخص کی سرپرستی کرے۔"

وہ شخص بھی آسانی سے شکست تسلیم کرنے والا نہ تھا۔ بولا:

"آپ خود اس کے لیے درخواست نہ بھی کریں تو دوسرے لوگ آپ کے لیے تگ ودو کر سکتے ہیں۔"

امین احسن بھی امین احسن تھے۔ انھوں نے جواب دیا:

"یہ حرکت وہی شخص کر سکتا ہے جو مجھ سے واقف نہ ہو۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ حکومتوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ان کے خوشامدیوں اور وظیفہ خواروں کے ہاتھوں آج تک کون سا کارنامہ انجام پایا ہے۔"

اس پر وہ شخص اجازت لے کر چلا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا دور حکومت تھا۔ان دنوں امین احسن رحمٰن آباد میں تھے۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر ان کے پاس آئے اور بتایا:

''حکومت آپ کی دینی خدمات کے صلے میں سول ایوارڈ دینا چاہتی ہے۔اس بارے میں آپ کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صاحب بھی امین احسن سے کچھ واقف تھے، مگر کچھ ہی واقف تھے زیادہ نہیں، امین احسن نے یہ پیشکش شکریہ کے ساتھ مسترد کر دی اور کہا:

''میں نے جو کچھ کیا ہے، اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے، ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ میں اس کا اجر اپنے رب سے چاہتا ہوں۔''

اگست ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم جنرل ضیاء الحق کی طرف سے آپ کو مشاورتی کونسل کی رکنیت پر آمادہ کرنے کے لیے آئے۔امین احسن نے کہا:

''میں تین اسباب کی بنا پر رکن بننا پسند نہیں کرتا۔ایک یہ کہ مجھے ثقل سماعت کا عارضہ ہے۔میں جب کسی کی سن نہیں سکتا تو مجھے سنانے کا بھی حق نہیں۔دوسرے یہ کہ میں ہمہ تن تفسیر لکھنے میں مصروف ہوں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ دوں گا، تفسیر لکھنے کا کام متاثر ہو گا جو مجھے قطعاً گوارا نہیں۔ تیسرے یہ کہ جنرل صاحب تین ماہ کے لیے حکومت سنبھال رہے ہیں تو اس طرح کے طول طویل کاموں میں کیوں پڑنا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کا یہ اقدام مناسب نہیں۔''

جنرل ضیاء الحق نے جب اپنی حکومت مستحکم کر لی تو امین احسن کے پاس ملنے کے لیے آئے اور پیش کش کی کہ وہ ان کی ضروریات پوری کرنا اپنی سعادت سمجھیں گے۔امین احسن کا جواب تھا:

''میں ایک درویش آدمی ہوں۔ میری کوئی ضرورت نہیں۔اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر سہولت دے رکھی ہے اور میں نہایت اطمینان سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔''

اردو تفاسیر پر کام کرنے والے ترکی کے محقق جناب عبد الحمید بر ایشق نے امین احسن کے اس وصف کے بارے میں لکھا:

''صحیح اسلامی معاشرے میں علم اور عالم کا رتبہ بہت اونچا ہے۔'ربة العلم العی الرتب'۔عالم کو کسی دنیوی منفعت کے لیے اس کی بے قدری کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو 'اشتروا بآیت

اللہ ثمنا قلیلا‘ (وہ اللہ کی آیات کا حقیر پونجی کے عوض سودا کرتے ہیں) کا مصداق بن جاتا ہے۔ جب میں پاکستان میں تھا تو اس دوران حکومت چار مرتبہ تبدیل ہوئی۔ ان تبدیلیوں میں کچھ بڑے بڑے عالموں نے معمولی منفعت کی خاطر ایسے لوگوں کا ساتھ دیا جن سے ملک، ملت اور دین اسلام کو کبھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا اصلاحی نے اس طرح کی کمزوری بھی کبھی نہیں دکھائی۔ میری معلومات کے مطابق جماعت اسلامی سے ان کی علیحد گی نظم جماعت میں مشاورت کے اصول پر ہوئی۔ جب ایک معاشرہ مشاورت کو حقیقی اہمیت نہ دے تو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔“ (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۹۱)

سردار محمد اجمل لغاری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”امید ہے کہ آپ اور جملہ متعلقین بہمہ وجوہ بالکل بعافیت ہوں گے۔ عرصہ سے آپ کی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ کبھی کبھی دو حرف لکھا دیا کریں تو کیا گناہ ہو!

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو!

میں الحمدللہ اچھا ہوں اور برابر اپنے کام میں مصروف۔ تدبر قرآن کی چوتھی جلد مکمل کر کے ڈاکٹر صاحب کے حوالہ کر دی۔ اب پانچویں پر کام کر رہا ہوں۔ اس وقت تفسیر سورۂ نمل زیر قلم ہے۔

حکومت کی طرف سے برابر باصرار یہ خواہش ہے کہ مشاورتی کونسل کی رکنیت منظور کر لوں لیکن میں نے بوجوہ گوناگوں معذرت کر دی ہے۔ اگر آپ کو کوئی اس بیچ میں ڈالے تو براہ کرم آپ بھی معذرت کر دیجیے گا۔ میں نے یہ اس لیے عرض کیا ہے کہ بعض وجوہ سے اس کا امکان ہے۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۹۴)

[باقی]

تبصرۂ کتب

معاویہ محب اللہ[1]

”قرآن و سنت کا باہمی تعلق“

کتاب: قرآن و سنت کا باہمی تعلق

مصنف: ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

ناشر: المورد: ادارۂ علم و تحقیق

صفحات: ۵۳۶

قیمت : ۹۵۰

تعارف نگار: معاویہ محب اللہ

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر صاحب علم و تحقیق کا بہت ستھرا ذوق رکھتے ہیں، اس سے پہلے بھی آپ کے قلم سے کئی تحقیقی کاوشیں منظر عام پر آ چکی ہیں: ”فقہ الحدیث میں فقہاے احناف کا منہج“، ”فقہاے احناف اور فہم حدیث“، ”براھین“، ”حدود و تعزیرات: چند اہم مباحث“، ”جہاد- ایک مطالعہ“۔ ماہنامہ ”الشریعہ“ کی ادارت آپ کی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہے، جب تک آپ ”الشریعہ“ کے مدیر رہے، رسالہ کو انتہائی علمی و تحقیقی معیار پر پابندی کے ساتھ قائم رکھا۔ زیر تعارف کتاب تو گویا آپ کے تحقیقی ذوق آئینہ ہے۔

قرآن و سنت کے درمیان باہمی تعلق کی بحث اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت لطیف اور نازک ہے، صدیوں

ا۔ فاضل علوم اسلامیہ و تکمیل افتاء المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد۔ پالنپور، گجرات، انڈیا۔

سے لے کر آج تک ہر زمانہ کے بہترین دماغوں نے اس بحث کو اپنی جد و جہد کا محور بنایا ہے، اس کی نزاکت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر مجتہد نے اپنے زاویۂ نظر سے دوسرے مجتہد کے رجحان پر نقد و تبصرہ کا حق ادا کیا ہے، اور اس کی خامیوں اور کم زوریوں کی طرف رہنمائی کر کے اصلاح کی کوشش کی ہے، یہاں تک کہ احناف ائمہ نے حنفی اصولیین کی اور شوافع ائمہ نے امام شافعی کے اصولی رجحان کی خامیوں کو تسلیم کیا ہے، چنانچہ اس بحث کو سنجیدگی اور گہرائی سے سمجھنے والے اہل علم دونوں کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے کتاب میں اسی قرآن وسنت کے باہمی تعلق کے رجحان کی تاریخی نوعیت کو بالتفصیل بیان کیا ہے، سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریعی مقام اور اطاعت رسول کی اہمیت کو بیان کیا ہے، آپ کی عین ذات بحیثیت رسول احکام کا مآخذ تھی، قرآن مجید میں جا بجا اطاعت الٰہی کے ساتھ اطاعت رسول کو بیان کیا گیا ہے، اس کے باوجود خود دور نبوی اور دور صحابہ میں یہ رجحان عام تھا کہ فرمان رسول کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے، اور صحابہ کو جوں ہی قرآن کی کسی آیت کے مقابل رسول اللہ کے قول سمجھنے میں دشواری ہوتی یا قرآن کی ایک آیت کو دوسری آیت کے مقابل سمجھنے میں پیچیدگی پیش آتی، دفعتاً اپنا اعتراض پیش کرتے۔ سیدنا عمر، عائشہ، ابن عباس (رضی اللہ عنہم) نے مختلف احادیث کو قرآن کی روشنی میں رد و قبول کے معیار پر پرکھا ہے۔

دوسرے باب میں مذکور ہے کہ ابتدائی اسلامی تاریخ میں حدیث کے تعلق سے کیا کیا نقطہ ہائے نظر لائے جاتے تھے اور ان کا منہج کیا تھا؟ خوارج اور معتزلہ کے یہاں قرآن مجید کے فہم میں حرفیت پسندی اور ظاہریت کی بنیاد پر بہت ساری احادیث کو عدم قبول کا رجحان عام ہے، اس وجہ سے بے شمار متفق علیہ روایتوں کو بظاہر قرآن کے مقابل ہونے کی وجہ سے رد کر دیا گیا، انھی میں بہت ساری روایات بھی ہیں جن کو احناف اور دیگر صحابہ نے بھی قبول نہیں کیا ہے، لیکن دونوں گروہوں کے ورلڈ ویو میں بنیادی فرق ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ”اس سوال پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں بنیادی فرق نتیجے میں نہیں، بلکہ ذہنی رویے میں ہے، خوارج کا طرز فکر قرآن کے مقابلے میں احادیث سے بے اعتنائی کے رویے کا غماز تھا، جس میں ان کی سادہ فکری اور تفقہ کے فقدان نے ایک خاص طرح کی شدت بھی پیدا کر دی تھی۔“(۱۷)

امام ابن حزم اور اصحاب ظواہر کے علاوہ تقریباً تمام علمائے امت کے یہاں قرآن مجید کو مآخذ احکام میں اصل و بنیاد اور سنت رسول کو شرح و وضاحت کا درجہ دینا مسلم ہے، نیز قرآن مجید کا من و عن قطعی الثبوت ہونا اور اخبار آحاد کا ظنی الثبوت ہونا مسلم حقیقت ہے، اسی پیراڈائم کو مد نظر رکھتے ہوئے امام شافعی رحمہ اللہ نے سب سے پہلے کلامی انداز میں کتاب اللہ کے لیے سنت کا تشریح و تبیین ہونا متنوع حیثیات سے بیان فرمایا ہے:

ا۔ مجمل کی تفصیل۔ ۲۔ محتمل کی تعیین۔ ۳۔ ظاہری مفہوم میں توسیع۔ ۴۔ فروع ولوازم کی توضیح۔ ۵۔ قرآن سے استنباط۔ ۶۔ عام کی تخصیص۔ یہی عام کی تخصیص ہے جس میں امام شافعی نے اپنی حیرت انگیز ذہانت وفطری صلاحیت کا ثبوت پیش کیا ہے، اور قرآن وسنت کے باہمی تعلق کو بالکل منفرد انداز میں بیان فرمایا ہے۔

احناف بھی تشریح وتبیین کے ضمن میں: ا۔ مجمل کی تفصیل ۲۔ محتمل کی تعیین کے سلسلے میں امام شافعی کے ساتھ ہے، لیکن احناف اور امام شافعی کے درمیان نقطۂ اختلاف نسخ القرآن بالسنہ کے اوپر آکر واضح ہو جاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک سنت قرآن کی ناسخ نہیں بن سکتی، جب کہ احناف کے یہاں خبر متواتر، خبر مشہور اور وہ خبر واحد جسے تلقی بالقبول حاصل ہو جائے، اس سے نسخ القرآن بھی درست ہے۔ بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ احناف کے یہاں عام کی تخصیص کا اسلوب نسخ، تغییر اور تبدیل کے زمرے میں آتا ہے، جب کہ امام شافعی کے نزدیک عام کی تخصیص بھی تشریح وتبیین ہی کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے امام طحاوی کے موقف کی وضاحت کی ہے، جنھوں نے احناف اور امام شافعی، دونوں کے اصولی رجحان سے استفادہ بھی کیا ہے اور اختلاف بھی کیا ہے۔

البتہ امام ابن حزم رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر پوری امت کے علما وفقہا کے برخلاف منفرد رجحان پر قائم ہے، ان کے نزدیک کتاب اور سنت، دونوں وحی الٰہی پر مبنی ہے، ان میں قطعی وظنی کا سوال ہی بے معنی ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کی جو ذمہ داری لی ہے، وہ دراصل وحی الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ صحیح حدیث ہو اور اس کی حفاظت کا سامان نہ کیا گیا ہو، چنانچہ امام ابن حزم کے یہاں مآخذ احکام میں قرآن وسنت، دونوں کا یکساں مقام ہے۔ انھوں نے بعض باتوں میں امام شافعی اور احناف سے اختلاف بھی کیا ہے اور اتفاق بھی۔ اس کی روشنی میں اپنے نقطۂ نظر کو حیرت انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ''جمہور اصولیین اور احناف کا مکالمہ'' کے عنوان کے تحت دونوں کے اصولی موقف میں خامیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے، مثلاً احناف کے رجحان میں یہ کہ جن دلائل سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کہاں اسلوب عموم سے اللہ تعالیٰ کی مراد عام ہے اور کہاں نہیں، ان میں عقلی قرائن اور لفظ کے محتمل ہونے کے علاوہ ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ ظاہری عموم کے مراد نہ ہونے پر علماے سلف کا اتفاق ہو یا ان کے مابین اجتہادی اختلاف واقع ہوا ہو، اور انھوں نے اس اختلاف پر کوئی نکیر نہ فرمائی ہو۔ چنانچہ مذکورہ موقف میں آیت کے اپنے اسلوب اور قرائن کے لحاظ سے دلالت عموم کے قطعی ہونے میں حدیث جو کہ خارجی قرینہ ہے، سے استفادہ نہیں کیا، پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علماے سلف کے اجماعی فہم یا باہمی اختلاف کی صورت میں عدم نکیر

کو (جو خارجی قرائن ہے) کیونکر قبول کیا جاتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ امام طحاوی، علماء ماوراء النہر اور اخیر دور میں علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی اسلوب عام کے ہر وقت قطعی ہونے میں تردد کا اظہار فرمایا ہے۔

ایسے ہی احناف کا دوسرا نقطۂ نظریہ کہ "بیان کے مقارن ہونے" پر بھی فقہا نے تنقیدیں کی ہیں۔

نیز شوافع ائمہ نے امام شافعی کے موقف کی علمی الجھنوں کی وضاحت فرمائی ہے؛ اسلوب عموم ہر وقت قابل احتمال ہوتا ہے، اور وہ ظنی ہونے کے ساتھ تخصیص کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح جواز نسخ پر بھی شوافع ائمہ میں؛ امام الحرمین الجوینی، الکیا الہراسی وغیرہ نے اختلاف کا اظہار کیا ہے، یہاں تک کہ جمہور اصولیین؛ رازی، غزالی، آمدی اور زرکشی وغیرہ نے اسی موقف کی تائید کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے آٹھویں باب میں امام شاطبی کے منہج؛ مقاصد شریعت کی روشنی میں باہمی تعلق کی نوعیت کو اجاگر کیا ہے، احکام میں مقاصد شریعت کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ امام شاطبی کے یہاں تشریع کے مقاصد اور احکام شرعیہ میں ملحوظ انسانی مصالح کا تصور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاطبی مقاصد شریعت کی روشنی میں مآخذ میں قطعیت وظنیت کی بحث کو حل کرتے ہیں۔ اس بحث میں ڈاکٹر عمار ناصر صاحب نے پہلے مقاصد شریعت اور مصالح کا مختصر خلاصہ پیش کیا ہے، اس کے بعد ذکر کیا ہے کہ امام شاطبی کے یہاں نصوص اپنے ثبوت اور دلالت، دونوں اعتبار سے قطعی اور ظنی میں منقسم ہیں۔ نیز شاطبی کے نزدیک شریعت کلیات واصول اور جزئیات وفروع پر مشتمل ہے۔ کلیات سے مراد اجتماعی مصالح و مقاصد ہیں اور تمام کلیات قطعی دلائل سے ماخوذ ہوتے ہیں، یہاں تک کہ کلیات ثبوت اور دلالت، دونوں اعتبار سے قطعی دلائل پر منحصر ہوتے ہیں، اس بحث میں ڈاکٹر صاحب نے "الموافقات" سے امام شاطبی کے موقف کی بہترین وضاحت کی ہے۔

امام شاطبی کے نزدیک اخبار آحاد کا ظنی ہونا جس پر فروعات و جزئیات کا انحصار ہوتا ہے، اسے بھی حیرت انگیز نظام کے تحت جوڑتے ہیں۔ کلیات کے قطعی ہونے کے بعد جزئیات کے ظنی ہونے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ اس کے لیے انھوں نے ظنی دلائل کی قبولیت کے لیے مذکورہ معیار قائم کیا ہے: ۱۔ ظنی دلیل کسی قطعی اصول کی طرف راجع ہو تو قبول ہے۔ ۲۔ قطعی دلیل کی طرف راجع تو نہ ہو، البتہ قطعی دلیل کے معارض نہ ہو تو قبول ہے۔ ۳۔ ظنی دلیل کسی ایک قطعی کے معارض تو ہو، لیکن دوسری قطعی دلیل کے تحت آجاتی ہو تو قبول ہے۔ ۴۔ ظنی دلیل قطعی اصول سے معارض ہو اور دوسری قطعی اس کے مؤید نہ ہو تو ایسی ظنی دلیل کو رد کرنا واجب ہے اور نا قابل قبول ہے۔ غرض ڈاکٹر عمار ناصر صاحب نے امام شاطبی کے موقف کی دل نشیں وضاحت کی ہے، یہ باب علم وفن سے دل چسپی رکھنے والے ہر طالب علم کے لیے نہایت قیمتی ہے۔

اسی مقاصد شریعت کے پس منظر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے، اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' سے کتاب وسنت کے باہمی تعلق کے خطوط کی تعیین کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اخیر میں مکتب فراہی میں مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے کے بعد اپنے استاذ غامدی صاحب کے موقف کا خلاصہ اور مذکورہ تاریخی ورثہ سے تقابل پیش کیا ہے۔ غامدی صاحب کتاب وسنت کے باہمی تعلق کی بحث کو تاریخ میں ہونے والی بحثوں سے کیسے استفادہ کرتے ہیں؟ بطور خلاصہ عرض ہے کہ سنت کے کتاب اللہ کی تشریح و تبیین اور نسخ القرآن بالسنہ میں امام شافعی سے اتفاق کرتے ہیں۔ مآخذ شریعت میں ظنی اور قطعی دلائل میں امام شاطبی سے استفادہ کیا ہے، لیکن شاطبی کے یہاں کلیات تمام کے تمام شریعت کے مجموعی نصوص پر مبنی ہوتے ہیں، جب کہ غامدی صاحب کے یہاں تواتر اور عدم تواتر کو بنیاد کی بحث پیدا ہوتی ہے، اور تواتر میں ان کے نزدیک قرآن مجید کے ساتھ سنت بھی شامل ہے۔[2]

غرض ''کتاب وسنت کا باہمی تعلق'' نہایت عمدہ اور علمی و تحقیقی مواد پر مشتمل ہے، اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہو گا کہ ایک اعتبار سے امام شافعی کی ''الرسالہ''، امام ابو بکر جصاص کی ''الفصول فی الاصول''، امام ابن حزم کی ''الاحکام فی اصول الاحکام''، امام شاطبی کی ''الموافقات''، شاہ ولی اللہ کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور جاوید احمد صاحب کی ''میزان'' کے اکثر اصولی مباحث کی تلخیص کا گنجینہ ہے۔ قرآن اور حدیث کے ہر طالب علم کو میں اس بات کا مشورہ دوں گا کہ اس کتاب کو اپنے مطالعہ میں رکھیں اور بار بار پڑھیں۔ حدیث اور تفسیر پڑھانے والے اساتذہ اس کتاب کے مباحث کو از بر کر لیں تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ میں ڈاکٹر عمار ناصر صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ اس قدر نفیس تحقیقی کتاب پیش فرمائی ہے، یہ اس موضوع کا نقش اول ہے، لیکن نقش اول ہی ان مضبوط ستونوں پر قائم ہے کہ مستقبل میں اس موضوع پر لکھنے والوں کے لیے شاہ کلید ہے۔

۲۔ مکتب غامدی کے منہج سے اتفاق واختلاف فی الحال میرا موضوع نہیں ہے، لیکن یہ بھی اپنی نوعیت کی منفرد داستان ہے۔

Monthly
ISHRAQ
Lahore

January 2025
Vol.37 No.1
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ''اشراق'' کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ''اشراق'' کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت و فروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ''اشراق'' کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ''اشراق'' کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق